مافی الضمیر

سیّد ضمیر جعفری

مافی الضمیر

سیّد ضمیر جعفری

نام کتاب :۔ مافی الضمیر

مصنّف :۔ سید ضمیر جعفری

اشاعت :۔ بار سوئم، فروری ۱۹۸۵ء

تعداد :۔ ایک ہزار

سرِورق :۔ حمید ساغر

مکتبہ :۔ راول مطبوعات

قیمت :۔ ۵۰ روپے

پرنٹر :۔ ایس۔ٹی۔پرنٹرز، دریا آباد، راولپنڈی

مُشتاق احمد یُوسفی،

کے نام

فہرست

کرکٹ نامہ

حصّہ سوم

حرفِ سپاس

یہ "مافی الضمیر" کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ کتاب ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں نئی نظموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

سیّد ضمیر جعفری

یکم جنوری ۱۹۸۵ء

تشکّر

(طبع ثانی)

"مافی الضمیر" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں مکتبہ اُردو ڈائجسٹ لاہور کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ کتاب گذشتہ کئی برس سے نایاب تھی۔ اب یہ دوسرا ایڈیشن "جم ساہی ایسوسی ایٹس" کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت، ترویج کے سلسلے میں، مَیں مکتبہ اُردو ڈائجسٹ کی مساعی کا شکرگذار ہوں۔ زیرِ نظر ایڈیشن کی ترتیب و اشاعت میں میرے بیٹے سیّد امتنان ضمیر نے میری امداد کی ہے۔ نئے ایڈیشن میں "آخر۔ اول" کے عنوان کے تحت چند منظومات کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

ضمیر

۲۰ مارچ ۱۹۷۸ء

کھنیارہ شریف ثانی۔ ڈاک خانہ مندرہ

ضلع راولپنڈی

پیش لفظ

(طبع اوّل)

مَیں کوئی تیس بتیس برس سے ایک "بے قاعدہ باقاعدگی" کے ساتھ شعر کہہ رہا ہوں سنجیدہ بھی اور مزاحیہ بھی۔ سنجیدہ شاعری کے دو مختصر مجموعے "جزیروں کے گیت" اور "لہو ترنگ" (۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ "مافی الضمیر" مزاحیہ شاعری کا پہلا مجموعہ ہے اور عا کوئی نہیں، معذرتیں بہت سی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی معذرتوں کے ہجوم کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دو ایک موٹی موٹی معذرتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معذرتیں دراصل شکر و شکایت کی قبیل سے ہیں۔ شکر احباب کا، شکایت خود اپنی۔

یہ مجموعہ پبلک کے پُر زور اصرار پر تو نہیں، لیکن میرے احباب کے پُر زور اصرار پر یقیناً شائع ہوا ہے۔ بلکہ مجھ سے زیادہ انہیں کی توجہ و سعی سے شائع ہوا ہے۔ تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ میرے احباب ایک مدّت سے مجھ سے میری مزاحیہ نظموں کی اشاعت کا تقاضا کر رہے تھے۔ مگر میری طبیعت اِدھر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ تو اسلیے کہ شاید زندگی نے مجھ کو میری استطاعت سے زیادہ مصروف کر دیا ہے، لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ جب کبھی میں پلٹ کر اپنی کاوش پر نظر ڈالتا تو شعر کے علاوہ میں خود بھی اپنی نظر سے گرنے لگتا۔ یُوں محسوس ہوتا کہ جو بات کہنا چاہتا تھا، کہہ نہیں سکا۔ بات جس طرح کہنا چاہتا تھا اُس

طرح نہیں کہہ سکا۔ فکر کے راستے پر، ایوانِ معنی کے اندر داخل ہونا تو کجا ڈیوڑھی کے دربانوں سے علیک سلیک کی نوبت بھی مشکل سے آتی تھی۔ اور فنی تزئین و تہذیب کے اعتبار سے بیشتر تخلیقات کا گویا..... آگا بھی کھل رہا تھا، پیچھا بھی کھل رہا تھا۔

نہ لفظم ، نہ شعرم چہ معنیستم من !

جی چاہتا تھا بار دیگر سارے کلام کو ورکشاپ میں ڈال دوں۔ مگر اتنے میں دوستوں کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا کرنل محمد خان — اور میجر صدیق سالک — ایک روز میرے گھر آئے اور میری مزاحیہ شاعری کا سارا پلندہ اٹھا کر لے گئے۔ جاتے جاتے یہ کہہ گئے انشاءاللہ آپ کو اب طبع شدہ کتاب ہی ملے گی۔ چنانچہ مجھے اور میرے قارئین کرام کو یہ بات تقریباً بیک وقت معلوم ہو گی کہ اس کتاب میں کون کونسی نظمیں شامل ہیں اور ان کو کتنا اور کیسا شرفِ باریابی عطا کیا گیا ہے ؟

یہ مجموعہ اِن دوستوں نے مرتّب ہی نہیں کیا، بلکہ اِس کا نام بھی انہیں کا تجویز کردہ ہے۔ میرے نزدیک اِس کتاب کی سب سے بڑی (غالباً واحد) خصُوصیّت یہ ہے کہ یہ کتاب مصنّف کی زندگی ہی میں کچھ اس طرح شائع ہو رہی ہے جیسے مصنّف کے انتقال کے بعد شائع ہوتی۔ (اگر شائع ہوتی)

منظومات کو باقاعدہ مسودے کی صورت میں ڈھالنے کا فریضہ صدیق سالک نے ادا کیا اور اس بات کا اندازہ مَیں ہی کر سکتا ہوں کہ اصل مسوّدات کے کٹے پھٹے، آوارہ گرد اوراق میں بکھری ہوئی، مسخ و منسوخ تحریروں کے ملبے میں سے اشعار گھسیٹ کر نکال کر پہلے جوڑنا اور پھر لکھنا کسقدر کٹھن کام تھا۔ مسودہ تیار ہو گیا، تو انتخاب کلام کی غرض سے صف بستہ اشعار کی معنوی ٹرن آوٹ (TURN - OUT)، کا ملاحظہ کرنل محمد خان نے فرمایا۔

تنقیدی جائزے کے اس عمل میں، آپ نے "بنیادی جمہوریت" کے نمونے پر سہ منزلہ چھان پھٹک کا اہتمام کیا۔ مثلاً پہلے تو سارے کلام کو سر سے پاؤں تک خود دیکھ کر نظموں کی ذات پات کی نشاندہی کر دی پھر صدیق سالک کے ہمراہ ایک ایک نظم کا "انٹرویو" لیا کہ اسکی طبیعت اور صحت کیسی ہے؟ لباس کس طرح کا ہے؟ اندر کچھ ہے بھی یا نہیں؟ معاشرے اور سماج سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟۔۔۔ اور اگر یہ رپورٹ درست کہ اس عمل میں وہ اشعار کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے چلے گئے ہیں، تو ان کا سب سے زیادہ شکر گزار میں ہوں گا مسودے کی ایک نقل کرنل شفیق الرحمٰن — کو بھی مہیا کر دی گئی تھی چنانچہ وقتاً فوقتاً وہ بھی قدمے سخنے اِس "ادبی پریڈ" میں شامل ہوتے رہے۔ بریگیڈیر گلزار احمد صاحب خود بیک وقت اپنی دو تین تصنیفات میں لت پت ہو رہے تھے لیکن اسکے باوجود جب کبھی اُن کو موقع ملتا، اشعار کی سلامی لیتے ہوئے، مسودے اور منصوبے کی دیکھ بھال کر جاتے۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اور پھر ہمارے "یارانِ سنگاپور" کے سرخیل کرنل مسعود احمد کہ جس کی محبت اور رہنمائی میرے شعر کے پسِ لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔

طباعت و اشاعت کا بیڑا، ترتیب سے پیشتر ہی جناب الطاف حسن قریشی مدیر اُردو ڈائجسٹ نے بکمال مہربانی اُٹھا کر اپنے مکتبہ کے کندھے پر ڈال دیا تھا۔

احباب کی لگن "لگاؤ" اور "چاؤ" کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے اختیار اپنے گاؤں میں شادی بیاہ کی بعض تقریبات کا نقشہ تازہ ہو جاتا تھا جن میں گھر والوں نے صرف شادی کی تاریخ ہی کا اعلان کیا تھا۔ باقی تقریباً سارے انتظامات برادری کے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ کوئی "چارپائیاں" جمع کر رہا ہے، کوئی "بستر" کوئی "برتن"۔

حیران ہوں، اس بے پایاں خلوص و محبت کا شکریہ میں کیونکر ادا کر سکتا ہوں؛ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے خاموشی سے خداوند رحیم و کریم کی بارگاہ میں جھک جاؤں جس نے مجھ کو ایسے شفیق، مخلص اور پیارے دوستوں کی نعمت سے نواز رکھا ہے۔

یہ تو تھی حدیثِ تشکّر۔ اب شکایت کی حکایت سنیئے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شکایت مجھے اپنی ذات سے ہے۔ یہ خود ملامتی کا سا احساس ہے۔ فن کے تخلیقی تقاضوں کی فہرست آپ جانتے ہیں، بڑی طویل اور بڑی کٹھن ہے۔ کوئی بھی فن ہو، وہ فنکار سے پوری محبت مکمل خود سپردگی اور انتہائی ریاضت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے بغیر فن و فکر کے امکانات و مضمرات میں باریابی ناممکن ہے۔ ان تقاضوں کی تسکین تو خیر میرے بس ہی کی بات نہ تھی، مجھے اس امر کا بھی شدّت سے احساس ہے کہ خود اپنے اطمینان کی حد تک بھی، میں حسینۂ فن کی ناز برداری نہیں کر سکا ؎

شبم بہ گُفتن و روزم بہ تراش خائی رفت
غرض کہ مدّتِ عمرم بہ بے نوائی رفت

وہ تو یہ کہیئے کہ اُستاد عُرفی کا ایک شعر میری کمک پر آگیا۔ پھر میرا مسوّدہ ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا، جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ورنہ۔۔۔ بہر حال اب عُرفی کے اس شعر کا سہارا لے کر شوق و توفیق کا یہ "ما حضر" ارباب نظر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

زباں زنگفتہ فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شدہ سخن باقیست

سیّد ضمیر جعفری

اسلام آباد ۱۸ ار دسمبر ۱۹۶۹ء

میرا اِنتخابی منشور

خوشا اے ووٹرو! لو مَیں بھی اِک منشور لایا ہوں
تمناؤں کی مجبوری بیریوں پر بُور لایا ہوں
بہ صد اصرار اس چوگان میں لایا گیا ہوں میں
بڑی مشکل سے اِن جاڑوں میں گرمایا گیا ہوں میں
مَیں اپنی خود کشیدہ بھاپ پر آزاد لڑتا ہوں
اکیلا سارے اُستادوں سے بے اُستاد لڑتا ہوں
رقیبوں کو بھروسا ہو گا اپنے کارناموں پر
مجھے ہے فخر اپنے ماہرِ فن خانساموں پر
ہر اک دل بَند، حاجت مَند، کو خورسند کر دُوں گا
گلی کوچے کی گندی نالیوں کو بند کر دوں گا
"بجٹ" میں کم سے کم رکھوں گا خرچہ کارخانوں کا
مگر مِٹنے نہ دوں گا غلغلہ فِلمی ترانوں کا
مری جانِ حزیں کا بارِ غم ہلکا نہیں ہو گا!
کہ جب تک ہر گلی کے موڑ پر ندکا نہیں ہو گا
نئے اسلوب سے جُز بندیٔ کارِ جہاں ہو گی

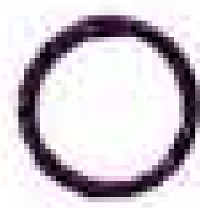
مرے سب دوٹروں کے گھر میں " راشن" کی دکاں ہوگی
بشر پر کھول کر سارے "مسامات خزدمندی"
مناسب حد میں رکھیں گے "زن آزادی و نزبندی"
گذشتہ دو صدی سے سخت "ٹھکسائے" گئے ہو تم
اب آسائش کی جانب گھیر کر لائے گئے ہو تم
کروں گا اور بھی پتلی قبائیں نازنینوں کی
مدارس میں رہیں گی چھٹیاں بارہ مہینوں کی
"کلاسیں" ہی نہ جب ہوں گی تو وہ کس کو پڑھائے گا
ہمارے دور میں ٹیچر فقط تنخواہ پائے گا
روایات کساد و کاہلی چمکائی جائیں گی!
جواں مردوں کی زلفیں پاؤں تک لٹکائی جائیں گی
ملائم گفتگو — دیہات کے عرضی گذاروں سے
ضمانت ہم یہ لیں گے کھردرے تحصیلداروں سے
حوالاتیں تو کچھ ہوں گی مگر "ٹھانے" نہیں ہوں گے
پریشانی کے اوپر یہ "پریشانے" نہیں ہوں گے
یہ کھائے روٹیاں میری، وہ نوچے بوٹیاں میری
"چمن میں ہرطرف" اڑتی ہوئیں لنگوٹیاں میری

(۱۴ فروری ۱۹۷۰ء) (اسلام آباد)

شب کو دلیہ دلا کرے کوئی
صبح کو ناشتہ کرے کوئی

اِس کا بھی فیصلہ کرے کوئی　　کس سے کتنی حیا کرے کوئی
آدمی سے سلوک دُنیا کا　　جیسے انڈا تلا کرے کوئی
چیز ملتی ہے ظرف کی حد تک　　اپنا چمچہ بڑا کرے کوئی
بات وہ جو کہو سرِ دربار　　عشق، جو برملا کرے کوئی
سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں　　دادی اماں کو کیا کرے کوئی
جس سے گھر ہی چلے نہ ملک چلے　　ایسی تعلیم کیا کرے کوئی
دل بھی اک شہر ہے یہاں بھی کبھی　　"اومنی بس" چلا کرے کوئی

ایسی قسمت کہاں ضمیرؔ اپنی
آ کے پیچھے سے "تا" کرے کوئی



گردنے ملتان تک اس طرح گردانا مجھے
میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے

فلسفے کا درک بخشا ہے تو اے مولائے کُل
اپنے گھر والوں پہ کچھ آسان فرمانا مجھے

مدّ و جزرِ زندگانی کی بدولت آ گیا
ہر قدم پر دو قدم پیچھے سرک جانا مجھے

حلقۂ دانش وراں کی سرگرانی کیا کہوں
بحث کے دوران سو جاؤں تو چونکانا مجھے

عُذر اپنے قتل ہونے میں تو کیا لاؤں گا میں
ہاں مگر کانٹے چھُری سے میز پر کھانا مجھے

شیخ صاحب مَیں نے بخشی ساری دُنیا آپ کو
آپ دے سکتے نہیں اِک خشتِ میخانہ مجھے

زندگی بھر عرضِ مطلب کی تمنّا ہی رہی
میری خاموشی سے بھی یارو سمجھ جانا مجھے

میں کہ ہوں اک مُستقل نامنتخب امیدوار
"مجلس ملی" کے باغیچے میں دفنانا مجھے

یار نے بیزار ہو کر آج خط میں لکھ دیا
"موم بتّی لے کے اب ڈھونڈے گا پروانہ مجھے

○

برطانیہ کی دو ادائیں

ستمبر ۱۹۷۰ء میں جب راقم الحروف لندن میں مقیم تھا، انگلستان کے ایک چڑیا گھر میں "وکٹر" نامی ایک زراف کا انتقال ہو گیا۔ ذیل کے اشعار "وکٹر" کی موت پر، برطانیہ کے اخبارات۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن میں خبریں شذرے۔ تبصرے اور تصویریں دیکھ سُن کر لکھے گئے۔ پوری قوم سوگ میں ڈوبی ہوئی پائی۔ (ض)

مر گیا ہے اک زراف مورگاہِ لندن میں
قوم سیلِ گریہ میں ڈوبتی سی جاتی ہے
صبح و شام چھپتے تھے غم گزٹ علالت کے
موت آنجہانی کی اشکِ خوں رُلاتی ہے
دِل گرفتگی طاری شوخ و شنگ لڑکوں پر
گُلرخوں کے چہرے پر سخت بے ثباتی ہے
اس کا ذِکر آتے ہی، اُسکا نام لیتے ہی
آنکھ ڈب ڈباتی ہے، بات تھرتھراتی ہے
ریڈیو سناتا ہے طول و عرض گردن کا
"ٹل ویژن" کی ہر مُورت اُسکی دُم اُٹھاتی ہے

نبض تھامے بیٹھے ہیں ۔ وکٹران نامِ آدر
ایک نرس آتی ہے ، ایک نرس جاتی ہے
چار کھونٹ برپا ہے ماتم آنجہانی کا
غم کی آنچ سچی ہے ، دل کا درد ذاتی ہے
اِس اتھاہ شفقت میں یہ تضاد بھی دیکھا
امتیازِ نسلی کی آگ کسمساتی ہے !
یہ عجیب بستی ہے ، نفرت و محبت کی
جانور کو روتی ہے ، آدمی کو کھاتی ہے

۱ے بائرن ایونیو ۔ ہنس لو ، لندن

(۲۱ ستمبر ۷۷ء)

پُرزے پُرزے کیوں ہوا دامانِ جاں مجھ سے نہ پوچھ
مَیں کوئی درزی ہوں، چل ہٹ اے میاں مجھ سے نہ پوچھ

یہ ترے حصّے کی ٹوپی تیرے سَر پر تھی کبھی،
یہ نہیں ہے وہ تو پھر ہے وہ کہاں، مجھ سے نہ پوچھ

"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی!"
زندگی کی ٹنکیاں اور نلکیاں مجھ سے نہ پوچھ

مَیں تو جلسے میں نہایت منہمک بیٹھا رہا
بانس لے کر اُڑ گیا کب سائباں مجھ سے نہ پوچھ

جہل غالب علم پر کیوں؟ مونچھ داڑھی سے بڑی
یہ جہاں تیرا ہے اے ربِّ جہاں مجھ سے نہ پوچھ!

اپنی ہانڈی خود پکا مسٹر اگر زندوں میں ہے!
کونسی اچھی ہے "چھچوں" کی دکاں مجھ سے نہ پوچھ

ووٹ کی تھی ایک پرچی، سو وہ تجھ کو ڈال دی!
اَب جو تو چاہے وہ کر، "جانِ جہاں" مجھ سے نہ پوچھ

آبگینوں پر طمانچے، آنگنوں میں راکھ دیکھ!
کاروبارِ شہرِ نو بالشتیاں، مجھ سے نہ پوچھ،

اے ادیب اپنا قلم مت دیکھ، اپنی کار دیکھ!
لُٹ گیا کیوں کوچۂ دانشگراں، مجھ سے نہ پوچھ

وُہ ضمیرِ بے نوا، وہ اک فقیرِ حال مست
ایسے بندوں کا فلاں ابنِ فلاں مجھ سے نہ پوچھ

جو اِنسان نوعِ انسانی کا استحصال کرتے ہیں
نہایت ریشمیں الفاظ استعمال کرتے ہیں!
کبھی اک سال میں ہم "مجلسِ اقبال" کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوّال کرتے ہیں

جہاں میں زور و زر والے، ہُنر والے، جبر والے
عموماً دوسروں کا مال —— استعمال کرتے ہیں
گِلہ کیسا گلی کوچے کی مخلوق ِ فراواں کا؛
یہ وہ کرتے ہیں جو ان کے گرُو گھنٹال کرتے ہیں

بسا اوقات کھُلتا ہی نہیں منشا حسینوں کا
قمیضیں سبز رکھتے ہیں دوپٹّے لال کرتے ہیں

جہاں کی تیز رفتاری کو روکا تو ہے کچھ ہم نے
ہمیں جو آج کرنا ہے وہ اگلے سال کرتے ہیں

کوئی دن تو طلوعِ عظمتِ انساں کا دن ہوگا!
چلو ہم آج اپنا آپ استقبال کرتے ہیں

بچارا مردِ مومن بھی تو آخر پیٹ رکھتا ہے!
مجاہد لوگ بھی روٹی تو استعمال کرتے ہیں،

میاں کا مشغلہ پوچھا تو بیوی نے یہ بتلایا،
وہ پہلے ڈاکٹر[1] تھے، آج کل ہڑتال کرتے ہیں

جزاک اللہ ضمیر اس تیرے طرز نے نوازی پر
ترے اشعار آنسو ہیں مگر خوشحال کرتے ہیں!

---

[1] جن دنوں یہ اشعار لکھے گئے ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بعض مطالبات منوانے کیلئے ہڑتال کر رکھی تھی۔

نام لکھوا کے خاکساروں میں — لوگ بیٹھے رہے چباروں میں

یہ ملاوٹ زدہ جواں دیکھو — پھول کمھلا گئے بہاروں میں

اب بھلا قربِ رہبراں کیسا ؟ — اب ہوا بھر گئی غباروں میں

قوم کچھ اور بھی ہوئی ٹیڑھی — جب سے راشن ملا قطاروں میں

منفرد ہیں کسی تو مَد میں ہم — پہلا نمبر ہے قرضداروں میں

ہم نے ہر انقلاب کو دیکھا — کچھ نئے کارکن تھے "کاروں" میں

کیا "چچا سام" کا سیام میں کام

یہ لڑائی ہے رشتہ داروں میں



ریواز کی تصویر

اسلامیہ کالج لاہور کے "ریواز ہاسٹل" کی چند جھلکیاں

ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کی ایک مقبول نظم کی "پیروڈی" ۔ موصوف سے معذرت کے ساتھ

معرکہ درپیش ہے ریوآز کی تفسیر کا
طالبانِ علم و فن کی بزمِ خوش تقدیر کا
کھینچ کر نقشہ دکھانا ہے پلاؤ کِھیر کا
کِھیر کا کھانا مگر لانا ہے جُوئے شِیر کا
شاعری میں باندھنا ہے دیگچے کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

بلّیاں یہ "زردہ پروردہ" ہماری بلّیاں
یہ پلاؤ خور، فیرینی کی ماری بلّیاں
موٹی موٹی، پتلی پتلی، بھاری بھاری بلّیاں
کاروباری بلّیاں، بے اعتباری بلّیاں
غُل ہے جن کے نغمۂ بیتاب و لقمہ گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

رفسٹ ایئر والوں کی گھبرائی ہوئی سی ٹولیاں
کمسن ہم جھولوں کی شرماتی ہوئی ہم جھولیاں"

میٹھے میٹھے قہقہے یہ پیاری پیاری بولیاں
ان سے کھیلی جا رہی ہیں شوربے کی ہولیاں
ان کے کپڑوں پر گماں گلمرگ کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

پاس کی گلیوں میں بچّوں کو سُلاتی لوریاں
"کارکن لوٹوں" کا اغوا، صابنوں کی چوریاں
چوریاں اور خوبرو چوروں کی سینہ زوریاں
صُبحوں کی خاموشیاں، راتوں کی شورا شوریاں
چہچہے بے فکریوں کے شورِ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

"روزِ فیشن"[1] مطبخوں کا آب و دانہ دیکھیے
جھومنا، گانا، بپھرنا، جگمگانا دیکھیے
دانہ دانہ چُن کے، بُن کے، دُھن کے کھانا دیکھیے
چل رہا ہے زندگی کا کارخانہ دیکھیے
"سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا

خوبصورت اچکنیں، زرکار جوتوں کی بہار
ہر طرف پنجاب کے طُرّے قطار اندر قطار

---

[1] خاص پکوان کے دن کو "فیشن ڈے" کہا جاتا تھا۔

رات کی جاگی ہوئی آنکھوں میں خوابیدہ خمار
پالتو مونچھیں، گھنیری، لہلہاتی، سایہ دار
ہے گماں اک ایک نوک مُو پہ نوکِ تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا
کچھ "پڑھاکو"۔ کورسوں کو بھی غذا سمجھے ہوئے
زندگی کو اِک مشقّت کی سزا سمجھے ہوئے
پاس ہونے کے لئے مرنا روا سمجھے ہوئے
دِل محمد[1] کے خلاصوں کو خدا سمجھے ہوئے
"نقشِ فریادی ہے جن کی شوخیٔ تحریر کا"
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا
جہلم و چناب کے "خاصانِ طرّہ باز" دیکھ
اُن کی زُلفِ سُنبلیں، اِس کی نگاہِ ناز دیکھ
ان کے حجروں میں کتابوں سے زیادہ ساز دیکھ
گت پہ طبلے کی ریاضِ علم کے انداز دیکھ
ہر کوئی رانجھا کسی اپنی خیالی ہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ریواز کی تصویر کا
فیل ہو ہو کر جو بن جاتے ہیں "ابطالِ عظیم"
جو ہیں اک مدت سے اِن محبوب حجروں میں مُقیم

---

[1] ریاضی کے نامور اُستاد۔ پروفیسر خواجہ دل محمد مرحوم۔

اپنے اُستادوں کے بھائی بند یارانِ قدیم
کتنی ہڑتالوں کے بانی، کتنے جلسوں کے زعیم
جذبہ ناپید امگر غُل نعرۂ تکبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے رلواز کی تصویر کا

"تنگنائے کیوبکل" میں شاعروں کا اک ہجوم
پچھلی دو صدیوں کے مستعمل تخلص بالعموم
ان کے شعرِ تر کی ہے پورے "عرب ہوٹل" میں دُھوم
ان کی صورت دیکھ کر میں جھومتا ہوں تو بھی جھوم
کچھ ہنر ہے تاجور[1] کا، کچھ اثر تاثیر[2] کا
ایک پہلو یہ بھی ہے رلواز کی تصویر کا

۱۰۵ ر رلواز ہوسٹل اسلامیہ کالج لاہور ۱۹۳۸ء

---

[1] علامہ تاجور نجیب آبادی مرحوم [2] پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر مرحوم

آتشدان کے حضور

(ٹین کا وہ گرانڈیل، بادبانی ساخت کا آتشدان جو فرش سے
اُٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر گردش کرنے کے بعد چھت سے نکل جاتا ہے)

میرے کمرے میں جو یہ دِل سرد آتشدان ہے
جنگِ عالمگیر کا ہارا ہوا جاپان ہے

فرش و عرش و میز و کرسی، بام و در کے درمیان
چُپ کھڑا ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

شُعلہ کیسا ایک چنگاری نکل سکتی نہیں
برف جم سکتی ہے اِس میں آگ جل سکتی نہیں

بے چمک، بے نور، لیکن دُور تک پھیلا ہُوا
مالٹا سے چل کے سنگاپور تک پھیلا ہُوا

کوئی ایسا کوئی مردِ خُدا پیدا کرے
جو اِس آتشدان کے دل میں جلا پیدا کرے

ہم نشیں آ اس کے ڈھانچے کو بجا کر تال دیں
دینے والوں کو دُعائے دولت و اقبال دیں

(کیمرون ہائی لینڈ) ۱۹۴۵ء

مجھے ذوق تماشا لے گیا تصویر خانوں میں

مرے پیشِ نظر ہے ایک سمتے ریٹ کا سِنما
پُرانے شہر کے سب سے پُرانے گیٹ کا سِنما
وہ دیکھو اکھڑا اکھڑا! اک اناڑی شہسوار آیا
کہ خود اُس پر تو رحم آیا مگر گھوڑے پہ پیار آیا
وہ شور اُٹھتا ہے اُونچی سیٹیوں کا، فُحش گانوں کا
کہ جیسے کوئی ہنگامہ الیکشن کے زمانوں کا
اِدھر تو پردہ تصویر پر تصویر جاری ہے
اُدھر جملہ صفوں سے نعرۂ تکبیر جاری ہے
اِدھر جب سطحِ سیمیں پر کوئی عورت دکھائی دی
تو بچّوں نے اُدھر آغوشِ مادر کی دُہائی دی
جو "پکچر" میں ذرا سا بھی "وصالِ یار" ہو جائے
تو "اہلِ دل" کو پوری زندگی دشوار ہو جائے
اُدھر جب "نرگسوں" اور "کرگسوں" میں سامنا ہوگا
اِدھر عشّاقِ دل بر دست میں محشر بپا ہوگا

کبھی رقصِ مسرّت میں، کبھی جوشِ رقابت میں
براہِ راست سب شامل ہیں ہیرو کی محبّت میں

یہاں جب فلم اکثر، اتفاقاً ٹوٹ جاتی ہے
تو اہلِ ذوق کی نبضِ تحمّل چھوٹ جاتی ہے

ہجومِ عام سے اُٹھی ہزار اقسام کی گالی،
کبھی اِس نام کی گالی، کبھی اُس نام کی گالی

وہ دیکھو ایک اونچے پیڑ پر گانے لگا ہیرو
محل تو تھا یہ رونے کا مگر گانے لگا ہیرو

اکیلے ہاتھ سے دس بیس تلواریں چلاتا ہے
جہاں چڑھنا بھی مشکل ہے وہاں سے کود جاتا ہے

یہ جب نکلے گا موٹر ریل کے ٹکر کھا کے آئے گا
بڑی محنت سے کوئی حادثہ فرما کے آئے گا

اگر مفلس ہے خود تو عشق مالا مال لڑکی سے
دگرنہ ڈھونڈ کر قلاّش و خستہ حال لڑکی سے

محبّت میں خیالِ خودکشی پیہم ضروری ہے
کہ مرنا سخت لازم اور جینا کم ضروری ہے

نہ جانے کتنی کنیاؤں سے عہدِ استواری ہے
کہ "ہیرو" - اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مکلف سوٹ پہنے ہے، بھر قد کاٹھ رکھتا ہے
نئے سیٹھوں، کنوارے افسروں کا ٹھاٹھ رکھتا ہے
نہ گھبراؤ نہ گھبراؤ اگر یہ مر بھی جائے گا
تو ہیروئن کی شادی پر یقیناً لوٹ آئے گا
یہ عورت چال اور افعال سے مردانہ لگتی ہے
کبھی سُلطان لگتا ہے، کبھی سُلطانہ لگتی ہے
جو شب کے دو بجے سلطانہ از جمخانہ می آئی
تو ماں نے کھانس کر پوچھا۔"چرا دُزدانہ می آئی"
بہو کی جھلملاتی اوڑھنی میں ساس لگتی ہے
اگر غازہ نہ ہو رُخ پر بڑی "بکواس" لگتی ہے
جو تھانیدار دکھلایا گیا وقتِ گرفتاری
"سراپا" نیم سرکاری، موٹاپا غیر معیاری
ہیروئن بھی پُرانی مہرباں معلوم ہوتی ہے
بسا اوقات تو ہیرو کی ماں معلوم ہوتی ہے
بغیرِ ساز و نغمہ خودکشی بھی کر نہیں سکتی
کہ جب تک ٹُھمریاں "ٹُھمرا نہ" لے گی مر نہیں سکتی
نظر آتا ہے جو چہرہ پری تمثال ہے گویا
یہ دُنیا خوبصورت لڑکیوں کا "ٹال" ہے گویا

کلیجہ تھام لو مجرے کی محفل جمنے والی ہے
یہ محفل جم گئی صاحب تو پھر کب تھمنے والی ہے؟

گھنیرے تاڑ کے جنگل سے قوالوں کی آوازیں
کئی صدیوں کی تانوں پر کئی سالوں کی آوازیں

میاں قوال نے لَٹ اس طرح لٹکا کے رکھی ہے
کہ جیسے ریس کے گھوڑے نے دُم کترا کے رکھی ہے

"دلہن" سے کوئی یہ کہہ دے کہ اتنا بھی نہ اترائے
مبادا ناک پھر جائے، مبادا مونچھ گر جائے

لڑائی میں رقیبوں سے وہ "اسلوب رواداری"
"نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری"

کئی زخموں سے چہرہ مستقل گُل رنگ ہے اس کا
شریفوں کے محلے میں محاذِ جنگ ہے اس کا

جو "میک اپ" میں محلے کا میاں رمضان ہے کوئی
یہ مغلوں کے زمانے کا مہابت خان ہے کوئی

جسے بہروپیا سمجھے تھے ہم "شاہِ جہاں" نکلا
ہنسی آتی ہے بے چارہ کہاں ڈوبا کہاں نکلا!

ابھی کیا ہے، ابھی اک گیروا سادھو بھی آئے گا
فقط آنے کے کیا معنی وہ گانا بھی سنائے گا

وہ دیکھو لب ہلے، لگا کہ رہے گا، جانتے ہیں ہم
ہمارے گھر ہی کا تو مال ہے پہچانتے ہیں ہم
یہ آتے ہی رُخِ حالات فوراً موڑ دیتا ہے
کہانی کے سب اجزائے پریشاں جوڑ دیتا ہے
ہمارا اور اِس سادھو کا یارانہ پُرانا ہے
کہ اِک مُدّت سے "ہر یکچر" میں اس کا آنا جانا ہے
جو قبرستان سے شادی کی شہنائی اُبھر آئی
تو وسطِ شہر میں دیوارِ تنہائی نکل آئی
کہانی میں جوانی اس طرح چھلکائی جاتی ہے
کہ چکنائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے
جو موہن مصرعیان فرمائشاً لکھوائی جاتی ہیں
وہ فیتہ ڈال کر پیمائشاً بنوائی جاتی ہیں
اُدھر اک طائفۂ "قلم اشاران" می رقصد
اِدھر "اصحاب پاکستان و بے مکستان
بلیغ الدین در دل، اندرونِ جان می رقصد
محمد خان جب رقصد علی الاعلان می رقصد

(۱۹۷۳ء)

نام کی ضرورت

قوم کو کام کی ضرورت تھی
اُور مجھے نام کی ضرورت تھی

تیرے کُوچے میں کل رقیبوں سے
بلوۂ عام کی ضرورت تھی

مَیں سمجھا تھا دوستی جس کو
وہ فقط کام کی ضرورت تھی

کون؟ ناصح؟ مگر حضور مجھے
آج آرام کی ضرورت تھی

جنگنز اور جینی

مضبوط ہوگیا ہے، چپک کر مشین میں
رشتہ نیاز مند میں اور نازنین میں
مصرعے الگ ہیں مگر اک زمین میں!
"جنگنز" "جین" میں ہے تو "جینی" بھی "جین" میں

۵ راکتوبر ۱۹۷۷ء (لندن)

صاحب کی بپتا'

۱۹۴۶ء کے اقتصادی بحران میں، بندھی ٹکی آمدنی والا طبقہ، جو دوسری جنگِ عالمگیر کے دوران مصنوعی معیارِ زندگی کا عادی ہو چکا تھا، بطورِ خاص متاثر ہوا تھا۔

(دہلی)

خانساماں ہے مُصر ہر شب چکن بنوائیے
حاضری پر "حاضر و غائب ٹماٹر" کھائیے
جیب کہتی ہے چھری کانٹے فقط کھڑکائیے
لنچ پر شلجم، ڈنر میں توریاں فرمائیے

مطبخوں میں "بوئے جوئے مولیاں" ٹن ٹن میاں[1]
دیو کی نندن ہوا گل شیر خاں، ٹن ٹن میاں

کھُردرے پالش سے خستہ بوٹ چمکائیں گے کیا؟
"تخت پوشی درزیوں" سے سوٹ سِل جائیں گے کیا؟
"ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟"
بیویوں کو، کوئی سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا؟

---

[1] کھسیانی ہنسی کے اظہار کے لیے اتنی ہی بے معنی آواز۔

بج رہی ہیں جنکی خالی چوڑیاں ٹن ٹن میاں!
دیو کی نندن ہو یا گل شیر خاں ٹن ٹن میاں!

یاالٰہی خیر رکھا ہے نیا بیڑا جو آج
یہ نہ سمجھے گا کبھی میری غریبی کا مزاج
لے چکا ہے، لارڈ اور لیڈی مڈلٹن سے خراج
اپنی یہ حالت کہ گھر میں ڈھب کی چھلنی ہے نہ چھاج

صاحب آزردہ ہے، بندہ بدگماں، ٹن ٹن میاں!
دیو کی نندن ہو یا گل شیر خاں، ٹن ٹن میاں!

مل گیا بنگلہ مقدر سے تو ہریالی نہیں!
حضرت والا نے کُتی گھاس تک پالی نہیں
اس بیاباں میں کوئی بُوٹا نہیں، ڈالی نہیں
آہ یہ کوٹھی کہ ویراں ہے مگر خالی نہیں

لٹ گئے سب اِسکے "گملے گملیاں" ٹن ٹن میاں
دیو کی نندن ہو یا گل شیر خاں ٹن ٹن میاں

لیڈری کا شوق، ذوقِ مینا بازاری بھی ہے
گھر کی مجبوری بھی جتانے کی لاچاری بھی ہے
فلم پر تنقید فرمانے کی بیماری بھی ہے
ہر ادا بیگم کی مہنگی ہے مگر پیاری بھی ہے

عشق اَور اندیشۂ سُود و زیاں ؛ ٹن ٹن میاں
دیو کی نندن ہویا گل شیر خاں، ٹن ٹن میاں

والدِ ماجد کا طنزِ تلخ و پیہم اور ہم
ماما کا دینا بیدار پُرنم اور ہم
مُستقِل روٹھی ہوئی بیگم کی بم بم اور ہم
گھر میں بے پھیلی ہوئی اَولادِ آدم اور ہم

سر گراں ہیں جن کی میلی ٹوپیاں ۔ ٹن ٹن میاں
دیو کی نندن ہویا گل شیر خاں ۔ ٹن ٹن میاں

ہو چکے ہیں جب سے نینی تال و دہرہ دون بند
بکس میں ہیں جو دھپوڑی کوٹ اور پتلون بند
ساغر و مینا میں اجمل خان کی معجون بند
صُبح کے مضمون ساکت، شام کے شبخون بند

جاؤ جمنا پر بجاؤ گھنٹیاں، ٹن ٹن میاں
دیو کی نندن ہویا گل شیر خاں، ٹن ٹن میاں

یاد آیا میکہ بازاروں میں اَرزانی بھی تھی!
نوعِ انسانی میں کچھ توفیق نادانی بھی تھی
نوکری میں، بندگی تو تھی، سُلیمانی بھی تھی
دن کی محنت تھی مگر راتوں کی سُلطانی بھی تھی

اے مرے دل! ٹن ٹنان! اے میری جاں! ٹن ٹن میاں
دیو کی نندن ہویا گل شیر خاں، ٹن ٹن میاں

آ رہے ہیں ہم

ہر سانس میں بیان دیئے جا رہے ہیں ہم
سمجھے ہوؤں کو اور بھی سمجھا رہے ہیں ہم

صابن دیارِ یار سے منگوا رہے ہیں ہم
لو اب لباسِ فقر کو دُھلوا رہے ہیں ہم

میں نے کہا تھا اِک جنم کا کل تو بھیج دو،
بولے کہ لو تمام چلے آ رہے ہیں ہم

اندازِ ربط و ضبط محبّت تو دیکھیئے
وہ جھوٹ بولتے ہیں قسم کھا رہے ہیں ہم

مانگی ہوئی ہنسی بھی بڑی پوچ چیز تھی
ہنسنے پہ یہ گماں تھا کہ شرما رہے ہیں ہم

واعظ کے ساتھ ہی سرِ منبر لٹک گئے
کیا نعمتیں حیات کی ٹھکرا رہے ہیں ہم

یہ اپنے اپنے عجز و مقدّر کی بات ہے
بوتے نہیں اناج مگر کھا رہے ہیں ہم

اِک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

(۱)

اسی میں ملّتِ بیضا سما جا، کُود جا، بھر جا
تِری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجا
نہ گنجائش کو دیکھ اس میں نہ تُو مردم شماری کر
لنگوٹی ڈکس، خُدا کا نام لے گھُس جا سواری کر
عبث گِننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفُوس اس میں
کہ نِکلے گا بہر عُنوان تیرا بھی جلوس اِس میں
وُہ کھڑکی سے کسی نے "مورچہ بندوں" کو للکارا
پھر اپنے سر کا گٹھڑ دوسروں کے سر پہ دے مارا
کسی نے دُوسری کھڑکی سے جب دیکھا یہ نظّارا
زمیں پر آرہا دھم سے کوئی تاجِ سرِ دارا
اگر یہ ریلوے کا سلسلہ ایران جا پہنچے
تو سکھّر پہ اُترتا شخص اصفہان جا پہنچے
یہ، سارے کھیت کے گنّے کٹا لایا ہے ڈبّے میں
وُہ، گھر کی چارپائی تک اُٹھا لایا ہے ڈبّے میں

کسی بیچاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے
کسی روزن سے اک کالا سلیپر منہ کو آتا ہے
کھڑے حقے بمعہ مینارِ آتشدان تو دیکھو
یہ قوم بے سروسامان کا سامان تو دیکھو
وُہ، اِک رسّی میں پُورا لاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ، بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں
صُراحی سے گھڑا، روٹی سے دسترخوان لڑتا ہے
مُسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے
جو نعمت چاہے سے جس بھاؤ بھی منگوائی جائے ہے
نہ کافر پھینکی جائے ہے نہ ظالم کھائی جائے ہے



وہ اک دانائے کُل لوگوں میں یوں گھُل مل کے بیٹھے ہیں
رضائی میں جو یُوں بیٹھے ہیں گویا سِل کے بیٹھے ہیں
عوام الناس کو درسِ فلاحِ عام دیتے ہیں
بہر سُو تھُوکنے کا فرض بھی انجام دیتے ہیں
اُدھر کونے میں جو اک مجلسِ بیدار بیٹھی ہے
کرائے پر الیکشن کے لیے تیار بیٹھی ہے
سیاست میں دمادم اپنا چمچہ مارتے جائیں
اگرچہ ہارتے جائیں مگر للکارتے جائیں

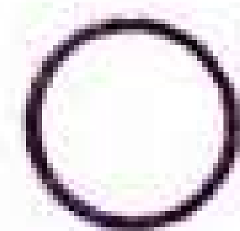
"اگرچہ سبز چارے کا وہاں توڑا نہیں کوئی
تعجب ہے کہ نیلی بار میں گھوڑا نہیں کوئی"

"بڑے لمڈے کو مولا بخش جی کتنا پڑھاؤ گے!
اُسے بی۔ اے پہ روکو گے کہ ایل۔ ایل۔ بی کراؤ گے؟"

"وہ بی۔ اے ہے مگر بی۔ اے کی خُو آئی نہیں اُسکو
ابھی ماں باپ کے کپڑوں سے بُو آئی نہیں اُسکو"

بہم یوں گفتگو میں آشنائی ہوتی جاتی ہے
لڑائی ہوتی جاتی ہے صفائی ہوتی جاتی ہے

تمناؤں کے نغمے چوڑیوں میں گنگناتے ہیں
پھر اِس "کورس" میں سب موجود بچے سُر ملاتے ہیں



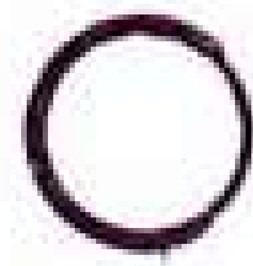
دریچوں سے ہویدا جسکی شان کج کلاہی ہے
یقیناً یہ گٹھیلا نوجواں ۔ فوجی سپاہی ہے

کسی دُھندلے سے اسٹیشن پہ آدھی رات اُترے گا
یہ صندوقوں کا سب لشکر بھی اسکے ساتھ اُترے گا

چمکتی سائینس ۔ رومال، شیشے، تیل بکسوں میں
خوشی کے کھیل بکسوں میں، دلوں کے میل بکسوں میں

ادھر کچھ ماورا، این واں فن کار بیٹھے ہیں
کہ جیسے گھوٹکی میں بھی سمندر پار بیٹھے ہیں

طبیعت ہی کچھ اس درجہ کی آتش گیر ہے ان کی
کہ انجن سے زیادہ گرم کُن تقریر ہے ان کی
کس اطمینان سے لالہ سمندر خان سوتے ہیں
لٹا کر ساتھ اپنے اپنا کُل سامان سوتے ہیں
میاں رمضاں یوں "فٹ" ہو گئے ہیں پیش منظر میں
سرِ دشانہ ترازو میں ۔ بقایا دھڑ کنستر میں
جناب نازؔ اپنے پاندان پر جھک کے بیٹھے ہیں
بیاضِ شعر بھی آغوش میں پھیلا کے بیٹھے ہیں
عطائی اِک طلسمی مومیائی لے کے آیا ہے
یہ مادر زاد اندھا روشنائی لے کے آیا ہے
وہ آپہنچا کوئی چمٹا بجا کر مانگنے والا
بہت مقبول ہے لوگوں میں گا کر مانگنے والا



کسی نے یوں گھریلو گفتگو پر زور ڈالا ہے
کہ جیسے لگلے اسٹیشن پہ رشتہ ہونے والا ہے
"زمیں آباد کتنی اور غیر آباد کتنی ہے ؟
تری تنخواہ کیا ہے ؟ خیر سے اولاد کتنی ہے ؟"
"دمِ ہجرت چچا مرحوم اپنے ساتھ کیا لائے !
زر و زیور وہیں چھوڑا مگر حقّہ اُٹھا لائے"

ودیعت جس قدر راہی کو ہے توفیقِ جاں کاہی
اسی نسبت سے مولیٰ ہے لفافوں کی خود آگاہی

وہی اس بھیڑ میں کچھ سرکش و بازو کشادہ ہے
صراحی جس کی اونچی ہے۔ ٹھکن جس کا زیادہ ہے

جن کو تھے مرغوب لہنگے جھنگ کے
اب وہ قائل ہیں قبائے تنگ کے

بے خودی میں بھی سلیقہ چاہیئے
یعنی گملے میں ہوں بوٹے بھنگ کے

تم بھی سیدھی بات کہتے ہو ضمیر
تم بھی شاعر ہو پرانے رنگ کے

زندگی آرزو ہے مرنے کی
موت کے رشتہ دار ہیں ہم لوگ

"کس کی حاجت روا کرے کوئی"
کس قدر بے شمار ہیں ہم لوگ

مہمان کا سامان ؔ

(اسلام آباد کے کوارٹروں میں)

جنابِ والا کہ یہ سات منزلہ صندوق ؟
کسی مکاں کے لئے ہے کہ لامکاں کے لئے!
جناب اس کا اگر ایک پٹ اکھیڑ سکیں
تو کام آئے محلّے میں سائباں کے لئے
جناب نے جو گھڑا یا ہے اِس زمانے میں
کبھی بنا تھا تجمّل حسین خاں کے لئے
جناب اِس میں جو سامان ٹھُنس کے لائے ہیں
یہ خاندان کے لئے ہے کہ سب جہاں کے لئے
لحاف، تکیے، ترازو، تنُدور غرضیکہ!
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"
جناب خود ہی بتائیں کہ ہم کہاں رکھیں!
نہ یہ زمیں کے لئے نہ آسماں کے لئے

(۱۹۶۲ء)

وبائے الاٹمنٹ

ہر سمت ہے بلند صدائے الاٹمنٹ
ہائے الاٹمنٹ تو وائے الاٹمنٹ
دُنیا ہے اور دینِ دلائے الاٹمنٹ
اب لوگ جی رہے ہیں برائے الاٹمنٹ
بندوں کا اَب خدا ہے خدائے الاٹمنٹ

چکّی مِلے، مشین ملے، بادباں مِلے
پانی ملے، زمین ملے، آسماں مِلے
کچھ تو مِری جناب ملے، مہرباں مِلے
ہر چند حق نہیں ہے مگر پھر بھی ہاں مِلے
یعنی الاٹمنٹ برائے الاٹمنٹ

ریڑی جو بیچتا تھا اُسے فیکٹری مِلی
پُورے تعلّقے کے عوض لانڈری مِلی
اِک دَر ہُوا جو بند تو بارہ دری مِلی
روٹی کوئی مِلا نہ مِلا لیڈری مِلی
اور لیڈری بھی وُہ جو کرائے الاٹمنٹ

کتنے مہاجرین تو آ کر، چلے گئے
پٹ توڑ کر، کواڑ جلا کر، چلے گئے
دیوار و در کو ٹھوک بجا کر، چلے گئے
یعنی مکیں مکاں ہی اُٹھا کر، چلے گئے

ہے سر پہ ساتھ ساتھ ہمارے الاٹمنٹ

کل تک گلی کے موڑ پہ جو کوٹتے تھے ٹین
"تختہ بدوش، ٹھیلہ بدست و تغار نشین"
اک اک کے پاس آج مشینیں ہیں تین تین
اکثر بزرگ اِن میں ہیں "لوکل مہاجرین"

بیٹھے ہیں دبدبے سے دبائے الاٹمنٹ

چہرے پہ میرے یار کے تازہ نکھار دیکھ
کیا روشنی کی چھوٹ ہے مونچھوں کے پار دیکھ
موٹر پہ اُڑ رہا ہے وُہ تُلّا کمہار دیکھ
"ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

اے مرحبا! یہ حُسنِ ادائے الاٹمنٹ

کوٹھی میں بود و باش کا گھمسان دیکھئے
یہ زندگی کا چاکِ گریبان دیکھئے
بیٹھی سے وُہ اٹا ہوا گلدان دیکھئے
جیسے گھسا ہو روس میں جاپان دیکھئے

ہاں دیکھیئے کہ جو بھی دکھائے الاٹمنٹ

پیادے ہوئے سوار کوئی پوچھتا نہیں
اچھوں کا حالِ زار کوئی پوچھتا نہیں
پیسے کے چار چار کوئی پوچھتا نہیں
"پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں"

خاموش زیرِ مشقِ جفائے الاٹمنٹ!

———— ۱۹۴۹ء

مہذّب بیبیوں کا رقص جاری ہے جہاں میں ہوں
مؤدّب شوہروں پر وجد طاری ہے جہاں میں ہوں
بہت دن عورتیں سہتی رہی ہیں جبرِ محکومی
مجھے ڈر ہے کہ اب مردوں کی باری ہے جہاں میں ہوں
ضمیرؔ جعفری تُم شکل و صورت ہی کو روتے ہو
یہاں تو عقل و دانش بھی اُدھاری ہے جہاں میں ہوں

————

.....روزے سے ہوں

مجھ سے مت کر یار کچھ گفتار، میں روزے سے ہوں
ہو نہ جائے تجھ سے بھی تکرار، میں روزے سے ہوں

ہر کسی سے کرب کا اظہار، میں روزے سے ہوں
دو کسی اخبار کو یہ تار، میں روزے سے ہوں

میرا روزہ اِک بڑا احسان ہے لوگوں کے سر
مجھ کو ڈالو موتیے کے ہار، میں روزے سے ہوں

میں نے ہر فائل "کی دُمچی پر یہ مصرع لکھ دیا
کام ہو سکتا نہیں سرکار، میں روزے سے ہوں

اے مری بیوی مرے رستے سے کچھ کترا کے چل
اے مرے بچّو! ذرا ہشیار! میں روزے سے ہوں

شام کو بہرِ زیارت آ تو سکتا ہوں ــــ مگر!
نوٹ کر لیں، دوست، رشتہ دار، میں روزے سے ہوں

تُو یہ کہتا ہے بہ لحنِ تر کوئی تازہ غزل!
میں یہ کہتا ہوں کہ برخوردار، میں روزے سے ہوں

"عید مِلن"

جس کے گھر بھی جائیے، کچھ پینا ہے، کچھ کھانا ہے
حلوۂ بیگانہ ہے اور بلوۂ مستانہ ہے
شوق کا اندازہ ہے نے بھوک کا پیمانہ ہے
دِل کو سمجھانے سے کیا حاصل کہ دِل دیوانہ ہے
پیٹ تر لقموں کا اک بھاری مسافر خانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

سر دفیرنی بہ مُرغِ آشیانہ ——— کھائیے
خُرمارِ شیریں بہ ظرفِ بیکرانہ ——— کھائیے
مخلصانہ دیکھیے پھر والہانہ ——— کھائیے
تر سویّوں کو تو بالکل عاشقانہ ——— کھائیے
لغزشِ مستانہ بھی اِک سجدۂ شکرانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

ہے میسّر آج تو شُربِ عرب، نانِ عجم
اُڑ کے ہر دانے پہ گر اے طائرِ بامِ حرم
زندگی؟ اللہ بس، باقی ہوس، کل تُم نہ ہم
"فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دِل یا شکم"

پیٹ اک محکم حقیقت ، دل فقط افسانہ ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

رِند خوش اوقات کے ہاں لطف انگیزی سے کھا
دوستوں کے گھر خوش آمیزی سے جاں تیزی سے کھا
مشرقیت کی فضا میں "فقرِ پرہیزی" سے کھا
ورنہ انگریزی میں ہنس ہنس کر دل آویزی سے کھا
"کٹلری اور بٹلری ٹپکانا اور نپکانا" ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

رسمِ دیدِ عید کی تمہید سے فوراً سنبھل
وقت کم ہے نعمتیں بسیار ہیں کھا اور ٹل
کم سے کم کر گفتگو اے شیرِ میدانِ عمل
عید مل آگے نکل ، کچھ دَر دہن ، کچھ در بغل
جانے کس کس کے ابھی زنجیرِ در کھڑکانا ہے
یومِ عید الفطر یارو یومِ آب و دانہ ہے

ویرانی نہیں جاتی

نظر کی عیب جوئی دِل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے بہ آسانی نہیں جاتی
مسلمانوں کے سر پر خواہ ٹوپی ہو نہ ہو لیکن!
مسلمانوں کے سر سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟"
کہ پیدا ہو گئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی
جہاں تک کثرتِ اولاد نے پوہنچا دیا اس کو
وہاں تک بندہ پرور نسلِ انسانی نہیں جاتی
یہ اچھی فقر و استغنا کی صورت ہے معاذ اللّٰہ
کہ پوری قوم کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی
مجرّد آرٹ کی لمبوتری عورت عجب شے ہے
جو اس کو دیکھ لو پھر دل پشیمانی نہیں جاتی

صاحبِ اولاد سڑکیں

زمیں پر آدمی کی اوّلیں ایجاد یہ سڑکیں
پُرانے وقت کے بغداد کی اولاد یہ سڑکیں
مرمّت کی حدوں سے زائد المیعاد یہ سڑکیں
ہمارے شہر کی مادر پدر آزاد یہ سڑکیں
بظاہر صید لیکن اصل میں صیّاد یہ سڑکیں
کمیٹی گھر میں ہے جو پاشکستہ، سرد جاں انجن
بظاہر دیکھنے میں اپنا "گونگا پہلواں انجن"
گراں پھر اس پہ زنگ آلودگی سے سرگراں انجن
کسی انگریز صدرِ بلدیہ کا رازداں انجن
اسی مرحوم کی مغموم سی اَولاد یہ سڑکیں
دمِ بارانِ رحمت گرد کا گرداب ہو جانا
گڑھوں کا پھیل کر تالاب در تالاب ہو جانا
بپھر کر نالیوں کا "رستم و سہراب" ہو جانا
محلّے کے گلی کوچوں کا زُہرہ آب ہو جانا
مہینوں تک برنگِ سرچہ بادا باد یہ سڑکیں
دُکانوں سے کھسک کر آگئے بازار سڑکوں پر

کھڑے ہیں مدّتوں کے "پالتو انبار" سڑکوں پر
کبڈی کھیلتے ہیں ارشد و ابرار سڑکوں پر
میاں رمضان گھر میں ان کے برخوردار سڑکوں پر
سوار و! دیکھنا ہیں صاحبِ اولاد یہ سڑکیں

بہرگامے سڑک کھا جانے والی کھائیاں دیکھو
چٹخنے راستوں کی ٹوٹتی انگڑائیاں دیکھو
کھڑی اونچائیوں کے پیٹ میں گہرائیاں دیکھو
گڑھوں کی جابجا "بہزادیاں، چغتائیاں" دیکھو
نقوشِ مانی و چغتائی و بہزاد یہ سڑکیں

ہم اِن سے حلم و صبر و شکر کا پیغام لیتے ہیں
کہ جب چلتے ہیں کم از کم خدا کا نام لیتے ہیں
یہ کام آئیں نہ آئیں ہم انہی سے کام لیتے ہیں
"گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"
ہم ان سے مطمئن ہیں اور ہم سے شاد یہ سڑکیں

کھڑا ڈنر

"بفِے دعوت" پہ بلوایا گیا ہوں
پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں
کبھی باتوں میں اُلجھایا گیا ہوں
کہیں کرسی سے ٹکرایا گیا ہوں
نہ آئی پر نہ آئی میری باری
پلاؤ تک بہت آیا گیا ہوں
کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو
کئی میلوں میں دوڑایا گیا ہوں
برائے قتلِ قتلہ ہائے ماہی
چھری کانٹے سے لڑوایا گیا ہوں
مٹر کے واسطے جب کی مٹر گشت
تو "آلو گوشت" میں پایا گیا ہوں
ضیافت کے بہانے درحقیقت
مشقت کے لیے لایا گیا ہوں

اِسلام کا نام تو عام لیا

(ایک ماڈرن قوالی)

جلسوں میں بھر تقریر لیا، نعروں میں بھر ہنگام لیا
خبروں میں بھر عنواں لیا، پرچوں میں بھر پیغام لیا
جلوت میں بہ کوئے عام لیا، خلوت میں بروئے جام لیا
"نوٹوں" پہ خدا کو بھول گئے، "ووٹوں" پہ خدا کا نام لیا

اِسلام کا نام تو عام لیا، اس نام سے کتنا کام لیا

مَیں ایم۔اے تھا وہ کچھ بھی نہ تھا مَیں کچھ بھی نہیں وہ افسر ہے
مَیں نیچے ہوں وہ اُوپر ہے، میں باہر ہوں وہ اندر ہے
مَیں گردِ درِ دفتر ہوں، وہ میر گدئ دفتر ہے
اور کیوں نہ ہو اس کا ایک چچا جو سَر تھا کبھی اب سر پہ ہے

میری ڈگری دَم توڑ گئی جب اُس نے چچا کا نام لیا

دامانِ چمن میں پھول بھی تھے، ہم ہی دل کو بہلا نہ سکے
دامن بھرتا تو کیوں بھرتا، ہم دامن ہی پھیلا نہ سکے
تشریحِ تمنّا ہو نہ سکی، توہینِ خودی فرما نہ سکے
گُل ہم تک اُڑ کر آ نہ سکے، ہم اُن تک چل کر جا نہ سکے

ہم رونے والوں میں کھِل کر پھولوں نے عبث الزام لیا

.....گھی کے ساتھ

گو زندگی کے ساتھ ہیں شرمندگی کے ساتھ
کوٹھی ہے ساتھ کار کے، روٹی ہے گھی کے ساتھ

یہ حادثہ عجیب ہوا آدمی کے ساتھ
تاریک ہو گئی ہے نظر روشنی کے ساتھ

دونوں کو اُن کے ظرفِ مروّت کی داد دو
راشد[1] کے گھر ہیں شام غزل جعفری کے ساتھ

ہم نے بھی چھوڑ دیں گے مگر آپ شیخ جی!
کچھ روز جا کے رہیئے کسی آدمی کے ساتھ

حافظ کی لے میں شعر تو ممکن نہیں ضمیر
طبلہ بجا رہے ہیں ذرا فارسی کے ساتھ

تھا فیصلہ غلط کہ نہایت غلط مگر!
بندے علی نے ووٹ دیا پارٹی کے ساتھ

---

1. مجتبیٰ۔ ن۔ م۔ راشد

مُرغی خانہ

(ایک استعارہ)

چند مُرغے مرغیوں نے کر کے باہم ساز باز
ایک ڈربے میں بنالی "مجلس بیضا گداز"
مدّعا یہ تھا کوئی تنظیم کا پیمانہ ہو
یعنی مرغی خانہ ہر پہلو سے مُرغی خانہ ہو
اِن میں کچھ بے آشیانے بے ٹھکانے مرغ تھے
اور کچھ جیّد گھرانوں کے پُرانے مرغ تھے
کچھ نجیب الاصل، تیز و تُند، جنگی مُرغ تھے
کچھ فرنگن مُرغیاں تھیں کچھ فرنگی مُرغ تھے
نازِ محبوبی سے پَر پھیلانے والی مرغیاں
ملّتِ بیضا کا دِل گرمانے والی مُرغیاں
سبز بھی تھے، زرد بھی تھے، کاسنی بھی لال بھی
نرم رُو اطفال بھی، پُختہ گور و گھنٹال بھی

اِک سیانے مُرغ نے دی بانگ ازراہِ کلام
السّلام! اے نازشِ مرغانِ عالم! السّلام!
اَے عزیز و یاد فرماؤ اگر کچھ یاد ہو
کن گراں مایہ شُتر مرغوں کی تم اولاد ہو؟
وُہ صبا رفتار، خوش گفتار، خوش کردار مُرغ
وُہ ہواں پرواز، موسیقار، شب بیدار مُرغ
زندگی کے جادۂ دُشوار و ناہموار پر
ہم چلیں گے اُن کے نقشِ پنجہ و منقار پر
تھی ابھی لرزاں فضاؤں ہی میں بانگِ اتحّاد
ہوگیا مُرغوں میں برپا ایک انڈے پر فساد

یہ بڑے صاحبوں کا ہوٹل ہے
اِس میں "آلِ سمور" رہتے ہیں
آج کل منبرِ رسولؐ پہ بھی
گ "بین السطور" رہتے ہیں
یہ گرانی بھی مہربانی ہے
ہم بُرائی سے دور رہتے ہیں

دو بھرے شناساؤں کی ملاقات

اُس نے کہا، آداب کرتا ہوں، کہو کیا حال ہے؟
اِس نے کہا، تھیلے میں دو رومال ہیں، اِک تھال ہے

اُس نے کہا، انساں میں اب کچھ ذوق ہمدردی بھی ہے؟
اِس نے کہا ہم کیا کریں، کھانسی بھی ہے، سردی بھی ہے

اُس نے کہا کچھ پیٹ بڑھ آیا ہے پچھلے سال میں
اِس نے کہا بریگیڈیر گلزار ہیں چکوال میں

اُس نے کہا، اس وقت شاید قصد ہے بازار کا
اِس نے کہا، بارہ بجے، دن ہو مگر اتوار کا

اُس نے کہا منجھلے چچا کیا اب بھی ہیں ملتان میں؟
اِس نے کہا کچھ درد سا رہتا ہے بائیں کان میں

اُس نے کہا، بیمار ہے بیگم گزشتہ رات سے
اِس نے کہا، اچھی کہی، دل خوش ہُوا اس بات سے

اُس نے کہا، انگلینڈ سے افسر کا تار آیا نہیں
اِس نے کہا، پھر تو کہیں، اُن کو بخار آیا نہیں

اُس نے کہا، امشب رسیلا رقص جمخانے میں ہے
اِس نے کہا، طفلِ جواں، گھر میں ہے یا تھانے میں ہے

اُس نے کہا، کیا آپ کو اپنی جوانی یاد ہے؟
اِس نے کہا، ہاں یاد ہے اور مُنہ زبانی یاد ہے

ترے حلقۂ سخن میں

ایک ژولیدہ گفتار بزرگ کے دھندلے دھندلے ملفوظات کا خلاصہ

اُستاد بولا۔ نیستی، ہستی کی موجودات ہے
شبنم کے باہر آنکھ ہے، پتھر کے اندر رات ہے
چڑیوں کی چونچیں سرخ ہیں، بازوں کی بازی مات ہے
یہ ڈال ہے، وہ پات ہے، یہ عکس ہے، وہ ذات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا کیا بات ہے کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ غنچۂ اُمید جب تک راس ہو
دشتِ سواد ماسوا زنجیرِ در کے پاس ہو
ذوقِ نظر گلبرگ ہو، کشتِ ہنر میں گھاس ہو
سیارگانِ شوق پر کچھ دھوپ، کچھ برسات ہے
شاگرد بولا، واہ وا، کیا بات ہے کیا بات ہے

اُستاد بولا ضم نہ ہو گردابِ استحصال میں
گو بھی اُگاتے جائیے اس سال پورے سال میں
بازیچۂ اطفال میں، باغیچۂ اقبال میں
معمورۂ جذبات ہے، مغفورۂ نغمات ہے
شاگرد بولا، واہ وا کیا بات ہے کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ کاہ پر کوہ گراں ہے زندگی
ماضی کی منکوحات سے فردا کی ماں ہے زندگی
کُن سے کُناں، چُن سے چناں، پُن سے پُناں نہے زندگی
ہر صُبح مدظلہٗ، پردہ بہ پردہ رات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ حرف و صوت و رنگ بے بنیاد ہیں
کچھ ہوش کے خرگوش ہیں، کچھ جوش کی اولاد ہیں
نقش سب وہم ایجاد ہیں، سب عکس مادرزاد ہیں
اک نیم بسمل فاختہ صورت گرِ حالات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ عشق برگِ زردِ نخلِ آرزو
ہر زاغ "پی پی در بغل" ہر شاخ "کوکو در گلو"
اک نغمہ نغمہ خامشی، اک نقطہ نقطہ گفتگو
جو شکل میں دو چار ہے، وہ عقل میں چھ سات ہے
شاگرد بولا۔ واہ وا، کیا بات ہے، کیا بات ہے

اُستاد بولا۔ عرفی و حافظ چمن بردوش تھے
اور میرزا غالب، خدا بخشے خمستاں نوش تھے
کچھ آپ بھی مدہوش تھے، کچھ باپ سے روپوش تھے
لطفِ زباں میں شہد ہے، زورِ بیاں میں دھات ہے

شاگرد بولا ۔ واہ وا ، کیا بات ہے کیا بات ہے

اُستاد بولا ، اب حدیث لامکانی کیا کہیں

کس رُخ اُڑے پھر کر کے مُرغِ آسمانی کیا کہیں

بیٹھے ہوئے ایّام کی " طوطا کہانی " کیا کہیں

اسلامیوں کی ہسٹری کچھ فارغ الاوقات ہے

شاگرد بولا ۔ واہ وا کیا بات ہے کیا بات ہے

یہی شوقِ نزاکت ہے اگر اپنے جوانوں میں

تو دیکھو گے بہن کی بالیاں ۔ بھائی کے کانوں میں

اُتار دطاق سے ان میں بھی جھانکو ، ان میں بھی دیکھو

مبادا شہد بیٹھا ہو پُرانے مرتبانوں میں

ضمیر اپنی طبیعت پر مجھے خود بھی تعجب ہے

ادیبوں میں ادیب اور پہلواں ہوں پہلوانوں میں

پیدا کرو

شوق سے لختِ جگر، نورِ نظر پیدا کرو
ظالمو! تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

ارتقا تہذیب کا یہ ہے کہ پھولوں کی بجائے
توپ کے دھڑ، بم کے سر، راکٹ کے پر پیدا کرو

شیخ، ناصح، محتسب، مُلّا کہو کس کی سنیں؟
یارو کوئی ایک مردِ معتبر پیدا کرو

میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر، آسان تر اور مختصر پیدا کرو

میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

میری دشواری کا کوئی حل مرے چارہ گرو
جلد تر پیدا کرو اور مختصر پیدا کرو

تیرے شعرِ تر کو یہ اولادِ آدم کیا کرے
بے نوازی، ہو چکی اب نیشکر پیدا کرو

کیا چھچھوندر سے نکالے ہیں یہ بچے شیخ جی
تلدِ عالم انہیں بارِ دگر پیدا کرو

میری درویشی کے جشنِ تاجپوشی کے لیے
ایک ٹوپی اور کچھ مرغی کے پَر پیدا کرو
حضرتِ اقبال کا شاہیں تو ہم سے اُڑ چکا
اَب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

طعن ہو، بہتان ہو، اِلزام ہو، دُشنام ہو
کوئی صورت ہو، مگر مشہور ہونا چاہیئے
دوستی کچھ اِس ہُنرمندی سے کی جائے کہ دوست
ہاتھ کے نزدیک، دل سے دُور ہونا چاہیئے

میاں رمضان گردن تک تو کچھ کچھ ٹھیک آتے ہیں
مگر پھر بعد کی گڑبڑ میں سَر پیدا نہیں ہوتا

بندر روڈ

اِک سے اِک تاجر بڑا دھنوان بندر روڈ پر
اِک سے اِک شاعرِ "عظیم الڈّان"[1] بندر روڈ پر
ہلکی ہلکی ساڑھیاں اور بھاری بھاری داڑھیاں
کُفر بندر روڈ پر، ایمان، بندر روڈ پر
صدر بھی جولانگاہِ عشق و مستی ہے مگر
عشق و مستی کا بڑا گھمسان، بندر روڈ پر
خود اُلٹ دیتے ہیں اپنے دستِ نازک سے نقاب
چاند سے چہرے، سرِ میدان، بندر روڈ پر
واقعہ اِک اِک جلیل القدر بندر روڈ کا
حادثہ اِک اِک عظیم الشان، بندر روڈ پر
زُلفِ بنگال و رُخِ پنجاب و ریشِ مردِ حُر
مختلف عنوان ہیں یک جان، بندر روڈ پر
اُجلے ایوانوں میں کالی ڈسنے والی منڈیاں
کھا گیا اِنسان کو اِنسان بندر روڈ پر

---

[1] ڈان کے عظیم الشان مشاعروں کی طرف اشارہ

زندگی اِک دوڑ، سرپٹ دوڑ مرنے کی طرف
آدمی حیران و سرگرداں، بندر روڈ پر

سیٹھ جی! اپنے جھروکے سے کبھی تو جھانکیے
سیٹھ جی وُہ دیکھیے انسان، بندر روڈ پر

چھوڑ کر لاہور کی گلیوں کو آخر آ بسے
سالکؔ[1] و حسرتؔ[2] سے نکتہ داں بندر روڈ پر

---

[1] مولانا عبدالمجید سالکؔ مرحوم
[2] مولانا چراغ حسن حسرتؔ مرحوم

شربتِ دیدار دیتے ہیں

وُہ سب کو تھوڑا تھوڑا شربتِ دیدار دیتے ہیں
مگر مصرُوف ہیں، اِتوار کے اِتوار دیتے ہیں

محبّت میں یہی اِک مشورہ سب یار دیتے ہیں
سرِ تسلیم خم کر، ہم اُنہیں تلوار دیتے ہیں

ابھی وُہ ساتویں درجے میں پہنچے ہیں بہ صد مِنّت
گزشتہ دس برس سے فیس برخوردار دیتے ہیں

وُہ کہتے ہیں کہ دُنیا امن و آسائش کی جنّت ہے
چلو ہم آج اُن کو آج کا اخبار دیتے ہیں

شرافت کی سند پیغام بر لایا تو کیا لایا
جو اچھے لوگ ہیں بیٹی کو موٹر کار دیتے ہیں

ترے کُوچے میں دیوانوں کا یہ جمگھٹ، تعجّب ہے
کہ دیوانے تو دیوانوں کو اکثر مار دیتے ہیں

ہماری سادہ لوحی کو وُہ نسبت ہے خسارے سے
کہ مرغے جیت بھی جائیں تو شاہیں ہار دیتے ہیں

ہوئی ہے نار گھر میں جب سے اُردو کی پذیرائی
اُنہیں عشّاق اب دو دو غزل کے تار دیتے ہیں

صدا الصحرا

شہر میں ٹیلی فون کا نیا کال سسٹم جاری ہوا تو سابقہ نمبر بھی تبدیل سب کے سب کرنے پڑے۔ اس سبب سے چند روز خاصے لطائف سرزد ہوتے رہے۔

مَیں نے گھر کو جو گھمایا کوئی دفتر بولا
پھر گھُمایا تو وہی "قندِ مکرّر" بولا!

"خاص نمبر" سے کوئی عام سخنور بولا
اپنی سلمٰی کو بلایا تھا "سکندر" بولا

یوں خواتین کا مردان خُدا ہو جانا
"باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"

یار ماشوؔ سے جو کی بات کہ او میرے رقیب
خوب پکڑے گئے کل شام فلاں بت کے قریب

اپنی صورت تو ذرا دیکھ شُترِ مُرغِ عجیب
وُہ یہ بولا کہ ہے بندہ صفِ اوّل کا طبیب

مَیں یہ بولا کہ ندامت بہ سخن ہے مجھ کو
شکوہ کس شخص سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

کوئی بولا۔ اسی اتوار کو ہم آئیں گے
امتنان اور سلیمان کو بھی لائیں گے

ناشتہ گول سہی، "لنچ" مگر کھائیں گے
تاش چھوڑیں گے تو شطرنج سے گتھ جائیں گے
میں یہ بولا کہ "ڈبل تین ڈبل چار" ہوں میں
وہ یہ بولا کہ ارے کتنا غلط کار ہوں میں

ایک شاعر کو پکارا کہ ملاقات کریں
کچھ مداوائے غمِ صورتِ حالات کریں
شام کو، حلقۂ رنداں میں خوش اوقات کریں
رات کو، روشنیٔ جام سے بارات کریں
وہ یہ بولا کہ "میاں گھی کا کنستر بھیجوں؟"
"مال باہر سے جو آیا ہے وہ اندر بھیجوں؟"

میں جسے شاد سمجھتا تھا پریشاں نکلا
سخت کافر تھا، یہاں مردِ مسلماں نکلا
ایک عطّار کو سونگھا تو غزل خواں نکلا
"قیس تصور کے پردے میں بھی عریاں نکلا
اتفاقاً کسی لبنیٰ کی کہانی سن لی
اور وہ بھی اسی کافر کی زبانی سن لی

جواں معلوم ہوتی ہے

جنابِ شیخ کی آنت میں جاں معلوم ہوتی ہے
بڑھاپے میں طبیعت نوجواں، معلوم ہوتی ہے

بہ فیضِ کثرتِ اولاد وہ نوبت بھی آ پہنچی
کہ اب منّے کی ماں، شوہر کی ماں، معلوم ہوتی ہے

دہن تو خیر پیش از غنچہ کھلتا ہی نہیں اُن کا
کمر ہے بھی تو وہ خُلدِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

طبیعت کی نہ پوچھو، ہاں مگر رخسار و گیسو تک
وہ ظالم کس قدر آرامِ جاں، معلوم ہوتی ہے

ہماری زندگی میں بھی ذرا سی روشنی کر دے
تری آنکھوں میں بجلی کی دکاں، معلوم ہوتی ہے

سیاست میں وفاداری میرے اللہ کیا شے ہے
یہاں محسوس ہوتی ہے، وہاں، معلوم ہوتی ہے

ضمیرؔ اُس شہر میں بھی مدتوں رہنا پڑا ہم کو
جہاں خانم بھی اک گلشیر خاں معلوم ہوتی ہے

کام آتا نہیں

نام اگر دیکھو تو کس شجرے میں نام آتا نہیں
کام اگر پوچھو تو کوئی خاص کام آتا نہیں!

فون پر باتیں ملاقاتوں میں حائل ہو گئیں
السّلام آتا ہے، وہ ماہِ تمام آتا نہیں

پڑھ رہا ہوں علم جس میں وہ زباں میری نہیں
کر رہا ہوں عشق جس سے اس کا نام آتا نہیں

اپنی روٹی خود پکا مسٹر کہ اب بیوی کے ساتھ
حسن آ جاتا ہے حسنِ انتظام آتا نہیں

بحث ہم دونوں میں جب ہوگی تو جھگڑا کیوں نہ ہو
مجھ کو علم اور آپ کو علمِ کلام آتا نہیں

حسن جب یکسر نمائش ہو تو اس کو دیکھ کر
جتنا پیار آتا ہے اتنا احترام آتا نہیں

کچھ ہنر، کچھ جستجو، کچھ سعی اے نورِ نظر!
صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں

بھائی مولا بخش کس کس فلسفے کو دوٹ دے
بھائی مولا بخش کو اپنا بھی نام آتا نہیں

میکدے سے بس اب اتنا ہی تعلق ہے ضمیر
مے کی خوشبو مجھ تک آ جاتی ہے، جام آتا نہیں

یہ کوہاٹ ہے

بے تکلف لوگ، ہنس مکھ کوچہ و بازار دیکھ
زندگی آزاد و خوش آمیز و کم رفتار دیکھ
وضع میں اِک بے نیازی کی ادا بیدار دیکھ
زُلفِ آوارہ کے نیچے لوگزی شلوار دیکھ
ہر پُرانی ڈیوڑھی پر اِک پُرانا ٹاٹ ہے
دوست یہ کوہاٹ ہے

نوجوان و پیر کیا پھرتے ہیں اِترائے ہوئے
سُرمئی لُنگی کے "لڑ" ماتھوں پہ اکڑائے ہوئے
کارتوسوں کے پٹے سینے سے لٹکائے ہوئے
اپنی توڑے دار بندوقوں کو چمکائے ہوئے
"ثاٹ" ایسا ثاٹ" ہے گویا بڑی تھری ناٹ[۱] ہے
دوست یہ کوہاٹ ہے

چیز جو بھی ہے جسامت کا نہیں حدّ و حساب
ہاتھ بھر کا نان دو دو ہاتھ کے "چپل کباب"
قُطر میں رسّی سے کچھ موٹا ہے فالودہ جناب
ایک ہی گچھے سے ہر معدے کا خانہ ہو خراب

۱؎ تھری ناٹ رفل

اِک فقط لوکاٹ "براندازہ" لوکاٹ ہے

دوست یہ کوہاٹ ہے

قہوہ خانے دیکھیے، قہوے کے پیالے دیکھیے
سر کے بل لٹکے ہوئے جالے ہی جالے دیکھیے
کس مزے سے پی رہے ہیں پینے والے دیکھیے
ڈھولکوں کی گت پہ چھم چھم چار تالے دیکھیے
ہر قبیلے کا الگ "شیزان" ہے "لنٹاٹ" ہے

دوست یہ کوہاٹ ہے

ہر طرف مردانِ کوہستاں کی آبادی ضمیر
خدّ و خال و قد و قامت میں صلابت کی نظیر
عورتیں بھی یُوں تو کچھ ہوں گی کہ ہے یہ ناگزیر
جانے کِن حُجروں میں ہے مدفون یہ حُسنِ اسیر
ریشم و کمخواب اندر ہوگا، باہر ٹاٹ ہے
الغرض کوہاٹ میں کوہاٹ ہی کوہاٹ ہے

۱۹۵۳ء

ایک غزل سُن کر

دریدہ دامنوں، خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں
قوافی میں وہی خُلد آشیانی حسرتیں اب تک
ردیفوں میں وہی مرحُوم ارمانوں کی باتیں ہیں
تصوّر اتنا گاڑھا ہے کہ صورت ہی نہیں بنتی
تصوّف اتنا گہرا ہے کہ تہہ خانوں کی باتیں ہیں
جو میخانے میں صدیوں سے کبھی چلنے نہیں پائے
اُن اڑیل ساغروں، اُن سُست پیمانوں کی باتیں ہیں
کہیں اغیار دُور از کار کا مربوط شکوہ ہے
کہیں کچھ "خاص رشتے دار بیگانوں" کی باتیں ہیں
مصائب سے زیادہ زرد رومانوں کا چہرہ ہے
حقائق سے زیادہ تلخ افسانوں کی باتیں ہیں

الیکشن کا بخار

جس کشادہ ڈیوڑھی کی چق اٹھا کر دیکھیے
باپ ووٹر، ماں "رضاکارن" پسر امیدوار
گفتنی ہے، کوبہ کو، خدمت گزاری کی حدیث!
دیدنی ہے، رُو بہ رو، امیدواری کا بخار
پھر رہی ہے تنگ گلیوں میں ہوس کی چاندنی
گر رہے ہیں خشک کوچوں پر طلب کے آبشار
چوک و چوپال و چمن میں شونکتے پھرتے ہیں وٹ
کوچہ و برزن کے اندر دوڑتی جاتی ہے کار
اُمڈ رہی ہیں اپنے اپنے من کی سُندر ممتیاں
بن رہے ہیں اپنے اپنے خواب کے نقش و نگار
یہ اچانک سی مروّت، "دفعتاً" سی دوستی؛
سب ضرورت کے تماشے، سب غرض کے اشتہار

شوہر ہو گیا

نعرۂ زندہ باد کا سر ہو گیا
کام اپنا بند ہ پرور ہو گیا

جو کمیٹی کا بھی ممبر ہو گیا
وہ بھی تقریباً منسٹر ہو گیا

در کچھ امکانات کے ایسے کھُلے
جو چُغد تھا وہ چقندر ہو گیا

اِک ذرا افسر نے مونچھیں چھوڑ دیں
محکمہ سارا مچھندّر ہو گیا

اُس کی اُردو میں تھی انگریزی بہت
لوگ یہ سمجھے کمشنر ہو گیا

مُفلسی میں جس کی داڑھی بڑھ گئی
زینتِ محراب و منبر ہو گیا

میرے شعرِ تر پہ ہنس لینے کے بعد
دیدۂ اہلِ نظر تر ہو گیا

اللہ یہ مساواتِ کبیرؔ
اَب گدھا گھوڑا برابر ہو گیا

آپ کچھ شرما کے لیڈر بن گئے
مَیں ذرا گھبرا کے نوکر ہو گیا
جانِ محفل تھا خدا بخشے، ضمیرؔ
اب تو اِک مدت سے شوہر ہو گیا

اُن کے پھاٹک میں یوں کھڑے ہیں ہم
جیسے ہاکی کے "گول کیپر" ہیں

پُرانی موٹر

(جاوید خٹک کی نذر)

عجب اِک بار سا، مُردار پہیّوں نے اٹھایا ہے
اِسے اِنساں کی بد بختی نے جانے کب بنایا ہے

نہ ماڈل ہے، نہ باڈی ہے، نہ پایہ ہے، نہ سایہ ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے

کوئی شے ہے کہ بین جسم و جاں معلوم ہوتی ہے
کسی مرحوم موٹر کا دُھواں، معلُوم ہوتی ہے

طبیعت مستقِل رہتی ہے ناساز و علیل اس کی
اَڑی رہتی ہے نہر اِس کی، پھٹی رہتی ہے جھیل اسکی

توانائی قلیل اِس کی تو بینائی بخیل اِس کی
کہ اِس کو مدّتوں سے کھا چکی عمرِ طویل اِس کی

گریباں چاک انجن یوں پڑا ہے اپنے چھپّر میں
کہ جیسے کوئی کالا مُرغ ہو گھی کے کنستر میں

ولایت سے کسی "سر جارج ایلن بی" کے ساتھ آئی
جوانی لُٹ گئی تو سندھ میں یہ خُوش صفات آئی

وہاں جب عین اس کے سر پہ تاریخِ وفات آئی
نہ جانے کیسے ہاتھ آئی مگر پھران کے ہات آئی

ہمارے ملک میں انگریز کے اِقبال کی موٹر
سن اڑتالیس میں پورے اٹھتّر سال کی موٹر
یہ چلتی ہے تو دو طرفہ ندامت، ساتھ چلتی ہے
بھرے بازار کی پوری ملامت، ساتھ چلتی ہے
بہن کی اِلتجا، ماں کی محبت، ساتھ چلتی ہے
وفائے دوستاں بہرِ مُشقّت، ساتھ چلتی ہے
بہت کم اِس "خرابے" کو خراب انجن چلاتا ہے
عموماً زورِ دستِ دوستاں ہی کام آتا ہے
کبھی بیلوں کے پیچھے جوت کر چلوائی جاتی ہے
کبھی خالی خُدا کے نام پر کھچوائی جاتی ہے
پکڑ کے بھیجی جاتی ہے، جکڑ کے لائی جاتی ہے
وُہ کہتے ہیں کہ اِس میں پھر بھی موٹر پائی جاتی ہے

اذیّت کو بھی اِک نعمت سمجھ کر شادماں ہونا
تعالی اللہ یُوں انساں کا مغلوب گُماں ہونا
اگر انسان اِس میں بیٹھ جائے اور یہ چل جائے
جو سردی ہو تو جم جائے، جو گرمی ہو تو گَل جائے
اچھل جائے تو یہ خطرہ کہ موٹر ہی نکل جائے
دبک جائے تو اندیشہ کسی پُرزے میں ڈھل جائے

گزرگاہوں کے سینے پر رواں ہے فیضِ عام اِسکا
کہ اک دو گام چلتے ہی چھلک اٹھتا ہے جام اِس کا

بہ طرزِ عاشقانہ دوڑ کر ، بے ہوش ہو جانا
بہ رنگِ دلبرانہ جھانک کر ، رُو پوش ہو جانا

بزرگوں کی طرح کچھ کھانس کر ، خاموش ہو جانا
مسلمانوں کی صورت دفعتاً پُر جوش ہو جانا

قدم رکھنے سے پہلے لغزشِ مستانہ رکھتی ہے
کہ ہر فرلانگ پر اپنا مسافر خانہ رکھتی ہے

دمِ رفتار دُنیا کا عجب نقشا دکھائی دے
سڑک بیٹھی ہوئی اور آدمی اُڑتا دکھائی دے

نظامِ زندگی یکسر تہ و بالا دکھائی دے
یہ عالم ہو تو اِس عالم میں آخر کیا دکھائی دے

روانی اِس کی اک طوفانِ وجد و حال ہے گویا ،
کہ جو پُرزہ ہے اک بپھرا ہوا قوال ہے گویا

شکستہ ساز میں بھی ، محشرِ نغمات رکھتی ہے
توانائی نہیں رکھتی مگر جذبات رکھتی ہے

پُرانے ماڈلوں میں کوئی اُونچی ذات رکھتی ہے
ابھی پچھلی صدی کے بعض پُرزہ جات رکھتی ہے

غم دوراں سے اب تو یہ بھی نوبت آ گئی، اکثر
کسی مرغی سے ٹکرائی تو خود چکرا گئی، اکثر

ہزاروں حادثے دیکھے، زمانی بھی، مکانی بھی
بہت سے روگ پالے ہیں ز راہِ قدر دانی بھی
خجل اِس سخت جانی پر ہے مرگ ناگہانی بھی
خداوندا نہ کوئی چیز ہو اتنی پُرانی بھی

کبھی وقتِ خرام آیا تو ٹائر کا سلام آیا
"تھم اے رہرو کہ شاید پھر بھی کوئی مشکل مقام آیا"

۱۹۵۵ء

راجہ اور راؤ

کوئی راجہ نہ کوئی راؤ ہے
اصل شے مرغ کا پلاؤ ہے

دلِ ناداں سے کیوں اُلجھتے ہو
زندگی چار دن کا چاؤ ہے

تم دوپٹہ ہی کھینچ کر رکھو
رُوس اور چین میں کھچاؤ ہے

کیمبرج کی سند نہیں جس پاس
لاکھ عالم ہو ماؤ ماؤ ہے

ملتفت بھی ہیں وہ گریزاں بھی
کچھ بہانہ ہے کچھ بہاؤ ہے

اپنے گھر پہ گماں ہوا اکثر
کسی انگریز کا پڑاؤ ہے

چل رہی ہے مشینِ مغرب بھی
اور مشرق میں چل چلاؤ ہے

آفریں ہے ضمیرؔ صاحب پر
لب پہ نغمہ ہے، دل میں گھاؤ ہے

ضمیر کا گھر

مجھے کچھ عرصہ ایک خستہ حال سے چوبی مکان (HUT) کے نصف حصے میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ مالک مکان نے "ہٹ" کے دو حصوں کو دو الگ الگ کرایہ داروں میں کچھ اسطرح تقسیم کیا تھا کہ آدمی خواہ کسی حصے میں رہے۔ ضرورت کی اکثر چیزیں دوسرے حصے میں رہ جاتی تھیں۔ ص

لکڑی کی "نصف ہٹ" میں بسیرا ہے آج کل
فِدوی بشر نہیں ہے "بٹیرا" ہے آج کل،
دو "کمریاں" کہ عرض ہے جن میں نہ طُول ہے
جینا اگر یہی ہے تو مرنا فضول ہے
جو چیز جس جگہ تھی ضروری وہیں نہیں
چھت بے تکلفی میں کہیں ہے کہیں نہیں
آواز جو بلند ہوئی پار ہو گئی
اب گھر میں بات چیت بھی دُشوار ہو گئی
پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے چھت بھی چلی ہوئی
"دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

دیوار اِس طرف ہے تو شہتیر اُس طرف
جلسہ اِدھر ہے نعرۂ تکبیر اُس طرف
"اسٹور" اِس طرف تو "کچن" دُوسری طرف
"بلب" اس طرف ٹنگے ہیں "بٹن" دُوسری طرف
شاعر اِدھر ہے، مشقِ سُخن دُوسری طرف
رَن اِس طرف بپھیا "بزن" دُوسری طرف
صحنِ چمن کی نہر، لبَن دُوسری طرف
نلکے کا دھڑ اِدھر ہے تو پھَن، دُوسری طرف
بیلیں اُگی ہوئی ہیں ترے در کے سامنے
کدّو اُچھل رہے ہیں مرے گھر کے سامنے
مرغوں کا شوق ہے جو اُدھر کے مکین کو
اچھی سزا ملی ہے اِدھر کی زمین کو
گھبرا کے پی گئے، کبھی کلغا کے پی گئے
پانی نیاز مند کے گھر آ کے پی گئے
کچھ بے وقوف مُرغ جو خود دار ہو گئے
وہ شام ہی سے فتنۂ بیدار ہو گئے
گائے جو پال رکھی ہے اطفال کے لئے
فی الحال کام آتی ہے، بھونچال کے لئے

رُوئے سُخن اِدھر تو سُخن دُوسری طرف
گھنٹی کا ٹن اِدھر ہے تو ٹن، دوسری طرف

مہمانِ محترم جو کوئی آ کے رہ گیا
کچھ ایسی شرم آئی کہ شرما کے رہ گیا

کھانا جہاں دیا وہیں ٹہلا دیا گیا
ٹہلا دیا گیا، کبھی لٹکا دیا گیا

ہم اس سے اور وہ جان سے بیزار ہو گیا
رِشتہ تعلقات کا ہموار ہو گیا

بستر ہے رہ گزار میں بستر کے سامنے
دارا پڑا ہوا ہے سکندر کے سامنے

آندھی میں رات کُرتہ و بنیان تو گیا
"اب خود بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا"

فرزند خیر سے جو یہاں چند ہو گئے
پیدا ہُوئے اُدھر کہ اِدھر بند ہو گئے

مسٹر کھلا

تیرگی آتی ہے قسمت میں تو پھر جاتی نہیں
میرے گھر کے سامنے لو "کوئلہ سنٹر" کھلا

پِن[۱] اے کھلی، ٹائی کھلی، بکلس کھلے، کالر کھلا،
کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں افسر کھلا

آٹھ دس کی آنکھ پھوٹی، آٹھ دس کا سر کھلا
لو خطیبِ شہر کی تقریر کا جوہر کھلا

سچ ہے مشرق اور مغرب ایک ہو سکتے نہیں
اُس طرف بیوی کھلی ہے، اِس طرف شوہر کھلا

اُن کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مُشتاقِ دید
مَیں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا

طبع شاہانہ ہے میری، وضع درویشانہ ہے
آستیں میں بنگلہ پنہاں، ہاتھ میں چھپر کھلا

شیخ مولا بخش بھی "اپوا"[۲] کے حامی ہو گئے
خیر سے اِس مسجدِ ویراں میں بھی مندر کھلا

مَیں نے غالب کے ادب سے اسمیں غواصی نہ کی
ورنہ تھا اِس "بحرِ بے پایاں" میں تو "سیور" کھلا

۱؎ PIN ۲؎ انجمن خواتینِ پاکستان

گھر میں کبھی جو بیٹھ گیا ہوں نماز میں
بچے اچھل پڑے ہیں "جبین نیاز" میں
کھلتا ہے اُن کے غسل کا "خانہ" مری طرف
گانا اُدھر ہے وجد میں آنا مری طرف

در اِس طرف تو پردۂ در دوسری طرف
ہر چیز الغرض ہے مگر دوسری طرف
"جینے سے یوں نباہ کیے جا رہا ہوں میں
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں"

سگریٹ نوش کی فریاد

لذتِ لب کے جو سگریٹ تھے وہ روپوش ہوئے
سازِ خاموش ہوئے، خوابِ فراموش ہوئے
دُود کش، کش بکش ہجر سے بے ہوش ہوئے
جو بلا نوش تھے وہ اور بلا نوش ہوئے

شوقِ بسیار نے "بیڑی" سے شناسائی کی
شعلۂ خس سے منور شبِ تنہائی کی

کاہشِ ذوقِ طلب میں سحر و شام پھرے
کار میں آپ تو بے کار میں خدّام پھرے
دوست احباب پھرے، نامہ و پیغام پھرے
ہر ٹھکانے سے مگر نادم و ناکام پھرے

لے کے بیٹھے کبھی حقّہ جو قدِ یار کیساتھ
خود گرفتار ہوئے مُرغِ گرفتار کیساتھ

کوئی سگریٹ جو کسی ذات کا پایا ہم نے
اُسے چوما، اُسے چاٹا، اُسے کھایا ہم نے
گھاس اور پھوس کو سینے سے لگایا ہم نے
"ٹھوٹس اور ٹھانس" کو آنکھوں پہ بٹھایا ہم نے

"جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ایک دو کش میں کہاں گرمیِ گفتار ملے

ہم چہکتے ہیں اگر بزم دھواں دھار ملے

ہائے یہ دن کہ نہ اک مشعلِ گلنار ملے

یار سے یار ملے بھی تو وہ بیزار ملے

خندۂ خوش، دلِ مائل، سخنِ خوب نہ مانگ

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"

عورتوں کی اسمبلی

(چھیڑ خوباں سے چلی جائے)

یہ نرگس، وہ نسرین، یہ سنبل و لالہ
گلابی سی گُلِ رُخ، غزل سی غزالہ
نظر میں ستارے، جبیں پر اُجالا
جو دیکھے، پکارے، ارے مار ڈالا
نہ کیوں دل نشیں ہو یہ تقریر سادہ
کہ الفاظ کم ہیں، تبسّم زیادہ
وہ شانوں پہ زرکار آنچل اُچھالے
اِدھر سے اُدھر مست زلفوں کو ڈالے
میاں اور بچے "خدا کے حوالے"
جبیں ہاتھ میں نرم فائل سنبھالے
کس انداز سے ناز فرما رہی ہے
کہ جیسے چمن میں بہار آ رہی ہے
مسائل ہیں جو دور ہیں ہو گئی ہے
وہ "ہاں" سے زیادہ "نہیں" ہو گئی ہے
بھڑک کر اگر خشمگیں ہو گئی ہے

تو پہلے سے بڑھ کر حسیں ہو گئی ہے

غزال اپنا رَم آپ کم دیکھتے ہیں
جو ہم دیکھتے ہیں وُہ ہم دیکھتے ہیں

دساور سے ہیروں کے ہار آ رہے ہیں
بھڑک دار ریشم کے تار آ رہے ہیں
نگاروں کے نقش و نگار آ رہے ہیں
سنگھار آ رہے ہیں، اُدھار آ رہے ہیں

یہ مانا کہ گھر میں خرابی رہے گی
مگر اوڑھنی تو گلابی رہے گی

مباحث میں یوں گرم گفتار ہیں سب
کہ بس لڑنے مرنے کو تیار ہیں سب
فسوں کار ہیں سب، طرح دار ہیں سب
برابر برابر کی سرکار ہیں سب

اِدھر اصغری بھڑ گئی اکبری سے
اُدھر طفل رونے لگے گیلری سے

"سپیچوں" میں گوٹے کناری کی باتیں
بہو کی کفایت شعاری کی باتیں
پڑوسن کی پرہیز گاری کی باتیں
غرض ہر بیاہی، کنواری کی باتیں

شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے، کبھی گال پر ہے
رواں ہیں ہجوم تجلّی کے دھارے
یہ آنچل سمیٹے، وہ گیسو سنوارے
دمِ گفتگو کوئی جیتے نہ ہارے
ستاروں سے ٹکرا رہے ہیں ستارے
بُوا کو تو دیکھو نہ گہنا نہ پاتا
بجٹ ہاتھ میں جیسے دھوبن کا کھاتا
وہ "لابی" کے جھرمٹ گلابی گلابی
وہ عارض شہابی، وہ لب لعل نابی
دوپٹے حسابی، قمیضیں کتابی،
وہ آپس میں باتیں شتابی شتابی
نہ یہ سُن رہی ہے نہ وہ سُن رہی ہے
یہ دل بُن رہی ہے وہ جاں بُن رہی ہے
بہ اندازِ غیظ و غضب بولتی ہیں
بہ آوازِ شور و شغب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں!
یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں
معاً اپنے خوابوں میں گم ہو گئی ہیں

ابھی جاگتی تھیں ابھی سو گئی ہیں

کوئی گھر میں طرزِ بیاں چھوڑ آئی
کوئی کار میں چابیاں چھوڑ آئی
یہ ہر بحث کو درمیاں چھوڑ آئی
وہ سب "فائلیں" نیم جاں چھوڑ آئی

حقائق کی سنگینوں نے صدا دی
تو یہ فاتحِ زندگی مسکرا دی

جو اوڑھے ہوئے شال ہے چار خانی
زمیں پر کوئی شعلۂ آسمانی
ہمہ بے یقینی، ہمہ بدگمانی
ذرا دیکھنا اِس کی آتش بیانی

وزارت کو مارے ہے یوں گفتگو سے
کوئی ساس لڑتی ہو جیسے بہو سے

بے ساختہ پن چاہیئے

مَیں نے پُوچھا سیٹھ دھن پرشاد سے مَن چاہیئے؟
سیٹھ جی بولے کہ سستا ہو تو سٹو ٹن چاہیئے

دلِ فراقِ یار میں ہر آن شُعلہ دربغل
چشمِ نم کو روز اک پانی کا گیلن چاہیئے

اور کچھ طے ہو نہ ہو اک چیز یہ طے ہو گئی
باپ کالا ہو مگر بیٹا "نکلسن" چاہیئے

چُست جاموں، "کَشت پتلونوں" سے یہ ثابت ہُوا
آدمی کو کس قدر بے ساختہ پن چاہیئے

ہم بھی کِس تہذیب کے سنگھم میں آ پیدا ہُوئے
ظرف رُومی چاہتے ہیں، حرف رومن چاہیئے

کچھ سفیدی، کچھ لچک، کچھ کُھردرا پن، کچھ مٹھاس
اپنے کلچر میں بھی سرگودھے کا مکھّن چاہیئے

جا پڑا اب خوشہ ہائے انجُم و پرویں پہ ہاتھ
اب ستارے لُوٹنے والے ہیں دامن چاہیئے

آرزوؤں کا یہ محشر ہے تو اے میرے خُدا
ظرفِ ہستی سے بڑا اِک اور برتن چاہیئے

کب تک آخر [illegible] کے اردگرد اُڑتے پھریں

اِس زمانے کے عقابوں کو نشیمن چاہیے
دیکھیے، مغرب کی اِس اُلجھن کو سلجھاتا ہے کون
جان روشن چاہیے یا کان روشن چاہیے
ہائے کس کمسن پہ کس موسم میں دل آیا ضمیرؔ
اُس کو فیشن چاہیے، فدوی کو پنشن چاہیے

دِل عبث بدنام ہے، ناصح عبث بدنام ہے
دِل کا اپنا کام ہے، گُردے کا اپنا کام ہے
فکرِ صبح و شام نے پروائے ننگ و نام ہے
عشق اگر یہ ہے تو یہ سب سے بڑا آرام ہے
اُس سے زعمِ دوستی ہے، جس نے میرے نام پر
یہ کہا — "ہاں ہاں کوئی جغرافیے کا نام ہے"

شہر کا بڑا بازار

دفعتاً اِک شور زندہ باد، مردہ باد کا
ایک سیلِ خشمگیں انبوہِ آدم زاد کا
پرچمِ خسرو پہ نقشہ تیشۂ فرہاد کا
یہ الیکشن ہو رہا ہے شہر کے اجداد کا
آگے آگے کار پیچھے پیچھے ہاہا کار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

شیخِ دوراں اِس طرف، حضرت کی دستار اُس طرف
خان صاحب خود اِدھر پھرتے ہیں شلوار اُس طرف
نصف گاہک اِس طرف، آدھے خریدار اُس طرف
خوب کاروبار ہے کار اِس طرف، بار اُس طرف
خود سڑک کے بیچ ٹھیلہ آر، سودا پار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

کافر و دیندار گڈمڈ ماہ رُخساروں کے بیچ
کار، بیکاروں کے پیچھے، پیدل، اسواروں کے بیچ
پھول اور کانٹے بہم، زردار ناداروں کے بیچ
جیسے گُتھ جائیں کئی عنوان اخباروں کے بیچ

اُونٹ سرکش، اسپ خود رَو، گائے خود مختار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

مست خاں مستی کا ہر جنجال پھیلائے ہوئے
مست خاں مستی میں سر کے بال پھیلائے ہوئے
عورتیں آنکھوں میں "نینن نال" پھیلائے ہوئے
مرد، ہونٹوں پر زبانِ حال پھیلائے ہوئے

ہاتھ میں گوبھی، بغل میں طفل، دل میں پیار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

وَجد فرماتے ہیں، لہراتے ہیں، ٹکراتے ہیں لوگ
وُہ اخوّت ہے کہ لوگوں پر چڑھے جاتے ہیں لوگ
یُوں بھی ناکردہ خطاؤں کی سزا پاتے ہیں لوگ
اپنی اپنی بکریاں بھی ساتھ لے آتے ہیں لوگ

جس کو سمجھا وُہ وہ لڑنے کے لئے تیّار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

رس ملائی میں ملائی جا رہی ہیں مکھّیاں
تھال میں ربڑی کے خود ربڑا رہی ہیں مکھیاں
میرا راشن مجھ سے پہلے کھا رہی ہیں مکھیاں
بوتلوں میں "غسلِ صحت" پا رہی ہیں مکھّیاں

شربتِ دینار کیا ہے شربتِ "کھیار" ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

دل یہ کہتا ہے کہ انگلستان لو، جاپان لو
جیب کہتی ہے گزی گاڑھے کی صدی تھان لو
مول کا ہر بول بھائی مان لو پر جان لو
ایک ہی قیمت ہے بیشک پان لو یا نان لو
نان بے مقدار ہے اور پان بدبودار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

ہوٹلوں میں شعر بر لب شاعرانِ پُرفسوں
گھر میں بیچاروں کا یہ عالم کہ پھرلی ماش ہوں
شعرِ تر میں لذّتِ مضمونِ دل بردن ہے یوں
"بلبل از گل" "گل ز بو"، "بو از گلاب آید بروں"
آگ ہے۔ مُردہ ہے، امرود ہے، فنکار ہے
یہ ہمارے شہر کا سب سے بڑا بازار ہے

(۱۹۶۰ء)

دفتر کے ساتھ ہیں

افسر کے ساتھ لوگ نہ دفتر کے ساتھ ہیں
سب اپنے اپنے "نان میٹر" کے ساتھ ہیں

آغا کی مونچھ دیکھ کے لوگوں نے دی خبر
اِک شخص ہیں کہ درّہ خیبر کے ساتھ ہیں

اُن سے تعلّقات پہ اِترا رہا ہوں مَیں
جن کے تعلّقات جہاں بھر کے ساتھ ہیں

کُھلتا نہیں یہ بھید کہ بزمِ سخن میں لوگ
طبلے کے ساتھ ہیں کہ سخنور کے ساتھ ہیں

بیگم کی چشمِ تر میں وہ سیلاب ہے کہ ہم
سولہ برس سے ایک سمندر کے ساتھ ہیں

منگلا کی سیر کیوں نہ ہو دو چند اے ضمیر
ہم آج اپنے حامد[1] و اختر[2] کے ساتھ ہیں

---

[1] راجہ حامد مختار کیانی [2] کرنل راجہ محمد اختر۔

سفر ہو رہا ہے

(کراچی شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر معذور ترین بس میں)

گریباں پسینے سے تر ہو رہا ہے
کمر بند گردن کے سر ہو رہا ہے
سفینہ جو زیر و زبر ہو رہا ہے
اِدھر کا مسافر اُدھر ہو رہا ہے
جو دیوار تھی اُس میں در ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

نشستوں پہ جتنے نشستہ ہوئے ہیں
وہیں جستہ جستہ نجستہ ہوئے ہیں
اُٹھے ہیں تو زنجیر بستہ ہوئے ہیں
گرے ہیں تو یکسر شکستہ ہوئے ہیں
نفس ہر نفس تیز تر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

کوئی پہلواں سیٹ میں دھم گیا ہے
بہت بھی گیا تو بہت کم گیا ہے
کوئی ہاتھ پتلون میں جم گیا ہے
کوئی ناک دیوار سے تھم گیا ہے

کوئی سرو قد مختصر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جواں کچھ سرِ پائیداں اور بھی ہیں
دریچوں میں سروِ رواں اور بھی ہیں
قطاروں میں بیوی میاں اور بھی ہیں
اُبھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ہجوم اور بھی معتبر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

وہ اک پیل تن یوں سمٹ کر کھڑا ہے
کہ پیٹ اس کا دھڑ سے الگ جا پڑا ہے
کسی کی گھڑی پر کسی کا گھڑا ہے
مقدّر کو دیکھو کہاں جا لڑا ہے
تماشا سرِ رہگزر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جہاں چند شاعر سواری کریں گے
تو لاری میں بھی نغمہ کاری کریں گے
غزل کو ترنّم سے جاری کریں گے
یہی مشغلہ باری باری کریں گے

فعولن میں عرضِ ہنر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے
جو خوش پوش گیسو سنوارے ہوئے تھا
بہت مال چہرے پہ مارے ہوئے تھا
بڑا قیمتی سوٹ دھارے ہوئے تھا
گھڑی بھر میں سب کچھ اتارے ہوئے تھا
بچارے کا حلیہ دِگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے
کوئی بے خبر، گلفشاں ہو گئی ہے
تو لاری کی لاری جواں ہو گئی ہے
طبیعت اچانک رواں ہو گئی ہے
ملاقات ان سے کہاں ہو گئی ہے
نظر سے طوافِ نظر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے
ڈرائیور اگر سیخ پا ہو گیا ہے
بھری گرد لے کر ہوا ہو گیا ہے
سفینہ سپردِ خدا ہو گیا ہے
ہر اک شخص محوِ دعا ہو گیا ہے

سفر ہر قدم پُر خطر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

کبھی پیش سے گھٹ کے پس ہو گئی ہے
کسی پیچ میں "پیچ کس" ہو گئی ہے

چلی ہے تو بانگ جرس ہو گئی ہے
رُکی ہے تو ٹھس ہو کے بس ہو گئی ہے

نہیں ہو رہا ہے مگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

جو گردن میں کالر تھا "لر" رہ گیا ہے
ٹماٹر کے تھیلے میں "ٹر" رہ گیا ہے

خدا جانے مرغا کدھر رہ گیا ہے
بغل میں تو بس ایک پَر رہ گیا ہے

کوئی مفت میں مفتخر ہو رہا ہے
کراچی کی بس سفر ہو رہا ہے

وہ لکھتے ہیں کچھ اپنے حالات لکھئے
گزرتے ہیں کس طور دن رات لکھئے

مشاغل بہ تفصیل اوقات لکھئے
جو لکھئے تو اب اور کیا بات لکھئے

کوئی کام ہم سے اگر ہو رہا ہے
کراچی کی بس میں سفر ہو رہا ہے

(ڈرگ روڈ۔ چھاؤنی) (۱۹۶۱ء)

شوق کی بلندی

میرے ایک شاعر دوست نے مکان تعمیر کرایا تو نقشہ بنانے میں کچھ اتنے مبالغے سے کام لیا کہ تعمیر کا کام ایک مدّت تک درمیان ہی میں معلق رہ گیا۔

اک بڑا شاعر، بہت چھوٹا سا جو افسر بھی ہے
ماورائے دو جہاں بھی داخلِ دفتر بھی ہے
مدّتوں سے پالتو انداز کا شوہر بھی ہے
خیر سے اولادِ بتدریج کا لشکر بھی ہے

قرض کی پونجی سے تعمیرِ مکاں کرنے لگا
مثلِ ابنائے جہاں، کارِ جہاں کرنے لگا

جب زمیں ڈھونڈھی تو بر رُوئے زمیں ملتی نہ تھی
جانے کن پردوں میں تھی پردہ نشیں ملتی نہ تھی
جیب سے جیب، آستیں سے آستیں ملتی نہ تھی
دل جہاں ملتا تھا، وہ ظالم وہیں ملتی نہ تھی

آخر اک جھلسے ہوئے ٹیلے پہ ڈیرا کر لیا
یعنی اُس شاہیں نے پربت پر بسرا کر لیا

آرزو نے خواب دکھلایا تھا جس تعمیر کا
اُس میں پتّا آب ہوتا تھا کسی جاگیر کا

جا بجا اپنا الگ کمرہ تھا خورد و پیر کا
خواب کا، احباب کا، تقریر کا، تحریر کا

"چوب برما" کے مصفا در، شگفتہ بام تھے
پتھروں کے نقش بھی صورت گرِ ایام تھے

بستیاں تو بستیاں معقول ویرانوں سے دور
بس کے اڈوں، ٹم ٹموں کے "ٹم ٹمستانوں" سے دور
سارے داناؤں سے، کم فکروں سے، نادانوں سے دور
شپرو بوم و زغن کے پاس انسانوں سے دور

گوشت سبزی دال آٹے کی دکاں کوئی نہیں
"اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہیں"

ایک بیٹھک ذوق و غالب کو منانے کے لئے
ایک حجرہ داغ کی غزلیں گوانے کے لئے
حرف گاہیں۔ قافیے دھونے سکھانے کے لئے
چار چھ چولہے فقط آلو پکانے کے لئے

برجیوں کا زاویہ دیکھو کہ رخ شہتیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تعمیر کا"

سابقہ کوچوں کی کوئی شے ادھر آتی نہیں
اپنے متروکہ بزرگوں کی خبر آتی نہیں

باس اُن گلیوں کی ٹیلیفون پر آتی نہیں
ریشماں آواز دیتی ہے، مگر آتی نہیں

ساتھ پٹری ریل کی، "پل" توڑیے کے تیل کی
ریڈیو میں شونکتی ہے کوک خیبر میل کی

دو کُشادہ "لان" تھے آبِ رواں کے ساتھ ساتھ
سرو چلتے تھے حدودِ گلستاں کے ساتھ ساتھ
ایک اُجلی شہ نشیں ہر آستاں کے ساتھ ساتھ
شیشہ ہائے نرم، سنگِ سخت جاں کے ساتھ ساتھ

حسرتِ دیوار و در بس سر اُٹھا کے رہ گئی
قرض کی توفیق تھوڑی دُور جا کے رہ گئی

گول کمرہ اپنی گولائی پہ آکر رُک گیا
فن کا نخرہ نصف انگڑائی پہ آکر رُک گیا
جشنِ جلوت، قیدِ تنہائی پہ آکر رُک گیا
یہ تماشا ایک رُسوائی پہ آکر رُک گیا

گردشوں میں خم نہیں ہے، دمدموں میں دم نہیں
چھت یہ کہتی ہے کہ مسٹر تم نہیں یا ہم نہیں

گھر کا کُل ساماں اِسی ارماں کے اُوپر رکھ دیا
اپنا مَفلر رکھ دیا، بیوی کا جھومر رکھ دیا
جانے کس عالم میں پہلے ایک پتھّر رکھ دیا

پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
کتنی چیزیں تھیں جو اس ملبے میں پنہاں ہوگئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

قرض خواہوں کا سلامِ رونمائی اور آپ
ٹھیکیداروں سے مسلسل آشنائی اور آپ
"آہن و سیمنٹ" سے پیہم لڑائی اور آپ
فاعلاً فعلاً میں مٹی کی کھدائی اور آپ
بے خودی بنیاد کا پتھر لگا کر اڑ گئی
شاعری دس بیس کاریگر لگا کر اڑ گئی

فن کے ساتھ

یہ عجب اُفتاد ہے اربابِ فکر و فن کے ساتھ
سازِ غالبؔ کی طرف، آواز ٹینی سن کے ساتھ

ایک زندہ باد اِک پائندہ باد اور اس کے بعد
ہم لپٹ کر سو گئے اپنے "ریزولیوشن" کے ساتھ

اللہ اللہ ایشیا میں تیل کی یہ ریل پیل،
اِک درم دو نان دس مہمان ہر گیلن کے ساتھ

ہم میں تم میں بس یہی پچھلی صدی کا فرق ہے
تم رہے "گیمن" کے پیچھے، ہم رہے جُمّن کے ساتھ

اَب ہوا معلوم دس بچّوں کی گٹھڑی سر پہ تھی
ہم یہ سمجھے تھے کہ حضرت ہیں کسی دھوبن کے ساتھ

بزمِ فن میں کس نے پُرسہ کہ بھیّا کون ہو
یُوں تو پاجامہ بھی تھا، پگڑی بھی تھی اچکن کے ساتھ

شیخ جی کے حق میں یہ مانگو دُعا اے دوستو
اُن کو روٹی بھی خدا بخشے دلِ روشن کے ساتھ

زیست کا معیار آخر کار اُونچا ہو گیا
آدمی کو موت تو آئی مگر فیشن کے ساتھ

باپ کا حصّہ کوئی قصّہ برائے نام تھا
اک عجب "ٹیڈی" سا کل دیکھا چچا چھکّن کے ساتھ

دیکھ اے دُنیا کہ ہم وہ بامروّت لوگ ہیں
دشمنی انگریز سے تھی لڑ مرے جرمن کے ساتھ

زندگی کی اینٹ پہلے دن ہی کج رکھی گئی
عشق مس زیب النساء سے عقد مس گلشن کے ساتھ

اک برس میں کیسے کیسے حادثے دیکھے ضمیرؔ
ہم تو سن پینسٹھ کو جا پونچے ہیں سن چھپّن کے ساتھ

کل شب جہاں میں تھا

پے بہ پے قوالیوں کی پالیاں ہونے لگیں
دن نکمے اور راتیں کالیاں ہونے لگیں
رفتہ رفتہ تالیاں بے تالیاں ہونے لگیں
ہوتے ہوتے مُشتعِل گھر والیاں ہونے لگیں

اِک میاں اُچھلا تو بیوی نے کہا اے جانِ مَن!
"تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!"

گانے والے راگ میں ٹھراگ کے اُستاد تھے
عقل میں "ہم زُلف" تھے اور شکل میں ہمزاد تھے
تال میں بھونچال تھے سُر سُرتیاں ایجاد تھے
یعنی اِس فن کے پُرانے "صاحبِ اولاد" تھے

اِبتدا یہ تھی کہ وُہ طبلوں کو سمجھاتے رہے
اِنتہا یہ تھی کہ طبلے آپ ہی گاتے رہے

لفظ کو رگڑیں بہت معنی کو پھیلائیں بہت
شعر کم گائیں مگر مفہوم سمجھائیں بہت
مُتقابِل بل کھائے نہ کھائے آپ بل کھائیں بہت
دَر مُقفّل ہے مگر زنجیر کھڑکائیں بہت

گردشِ معنی میں اسکندر کہیں، دارا کہیں
شعر کرتا کا کہیں، شاعر کو دے مارا کہیں

ساز سے آواز بڑھ جائے تو پسپائی کریں
راگنی بجھنے لگے تو "روش آرائی" کریں
نغمہ پیرائی میں جب پروازِ بالائی کریں
حرکتیں ایسی کریں جیسے کہ سودائی کریں

سازِ آوارہ، نوا گم، طبلچی چُور تھا
سرِ مغنی گویا پھانسی پر لبِ منصور تھا

تال دے کر جب کلامِ حضرتِ اقبال دیں
شعر کیا ہر لفظ کی چوکھٹ پہ چوکی ڈال دیں
شعر دیں پھر پرچۂ ترکیب استعمال دیں
قافیوں کو دُور تک کھینچیں ردیفیں ٹال دیں

فلسفہ تھا نذرِ نگوں، مفہوم خستہ حال تھا
شعر بچ نکلا تو یہ اقبال کا اقبال تھا

ایک دوہے کی "دوئی" سو بار دھرائی گئی
لَے کبھی چھوڑی، کبھی پکڑی، کبھی کھائی گئی
فارسی پنجاب کے کھیتوں میں دوڑائی گئی
شیخ سعدی کی غزل درگا میں "دُرگائی" گئی

سوہنی جس موج میں ڈوبی وہ جڑے شہر تھی
محملِ لیلیٰ کو اُلٹا یا تو اندھیر تھی

آغری گھمسان میں مہمان بھی گانے لگے
سُر سے عاری، تان سے انجان بھی گانے لگے
"لان" میں بیٹھے ہوئے دربان بھی گانے لگے
اچھے اچھے معتبر انسان بھی گانے لگے

دست و بازو، چشم و ابرو، گوش و سر ہلتے رہے
شام کو ہلنے جو بیٹھے رات بھر ہلتے رہے

ل ہمارے محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کو قوالی سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایسے اناڑی قوالوں کو پکڑ لائے جو کچے راگ میں کچے تان پلٹے لگانے اور الفاظ کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کے ماہر تھے۔ ماتحت عملہ کی چار راتیں اس شور و غوغا کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

بیماری کا نام

زندگی ہے مختلف جذبوں کی ہمواری کا نام
آدمی ہے شلجم اور گاجر کی ترکاری کا نام

علم الماری کا، مکتب چاردیواری کا نام
ملٹن اِک لٹھا ہے، مومن خان پنساری کا نام

صاف کالر کے تلے، معقول اُجلی سی قمیض
ہے بہت ہی مختصر سا میری دشواری کا نام

اُس نے کی پہلے پہل پیمائشِ صحرائے نجد
قیس ہے دراصل اِک مشہور پٹواری کا نام

عشق ہرجائی بھی ہو تو درد کم ہوتا نہیں
اِک ذرا تبدیل ہو جاتا ہے بیماری کا نام

کوئی نصب العین، کوئی عشق، کوئی چاندنی؟
زندگی ہے ورنہ اِک مصروف بیکاری کا نام

مدتوں دُزدیدہ، دُزدیدہ نظر سے دیکھنا
عشق بھی ہے اک طرح کی چوربازاری کا نام

میں نے تو اپنے لئے آوارگی تجویز کی
تم نے کیا رکھا ہے اپنی خود گرفتاری کا نام

بات تو جب ہے بدل جائے سرشت انسان کی
یُوں تو لکھ دینے کو لکھ دو اُونٹ پر لاری کا نام

دِل ہو یا دلیہ ہو ، دانائی کہ بالائی ضمیر
زندگی ہے بعض اشیاٗ کی خریداری کا نام

بس دُور ہی سے اُن کی ہنسی دیکھتے رہے
یعنی خوشی برائے خوشی دیکھتے رہے

عید کا میلہ

لو عید آئی، لو دو پُلے میدان میں پھر بازار لگا
ہر چاہت کا سامان ہوا، ہر نعمت کا انبار لگا
سب اُجلا شہر اُمنڈ آیا، شلوار سجا، دستار لگا
اِس بھیڑ کے بپھرے طوفاں میں جو ڈُوب گیا، سو پار لگا
ٹولی کے آگے ٹولہ ہے، "ریلی" کے پیچھے ریلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

مرکز رنگیں رعنائی کا، چکنا تنبو حلوائی کا
زینہ زینہ، زینت سے دھرا ہے تھال پہ تھال مٹھائی کا
گردن اُونچی رس گلّے کی، سر نیچا ہے بالائی کا
حلوائی دام بٹورنے میں سر مونڈ رہا ہے نائی کا
برفی، امرتی، پیڑا ہے، چم چم، لڈّو، گجریلہ ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

ڈھندلے ترپالی منڈوے میں ناٹک، نوٹنکی آئی ہے
نوبت، نقّارہ، سارنگی، ڈھولک، جھانجن شہنائی ہے
کُل سولہ "ٹیڈی پیسوں" میں کس دھوم کی راس رچائی ہے
لیلیٰ کے لبوں پر سُرخی ہے، مجنوں کے گلے میں ٹائی ہے

یہ ہنسنے میں من موجی ہے وہ گانے میں البیلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

اک سرکس ٹیڑھا میڑھا سا، انجام تو کیا آغاز نہیں
اس ریچھ کے منہ میں دانت نہیں، اس باز کی آنکھیں باز نہیں
وہ شیر کہ جس کی مونچھ تو ہے، پر جست نہیں، آواز نہیں
طوطا ہے تو خیر سے گونگا ہے، شاہیں میں پر پرواز نہیں
دو بندر ٹین کے اندر ہیں، دڑبے میں مرغ اکیلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

پگڈنڈی جگمگ منڈی ہے، بانسوں پر تنبو تانے ہیں
کچھ نئے نویلے ہوٹل ہیں، کچھ ریستوران پرانے ہیں
ہر ڈھنگ کے سستے کھانے ہیں، ہر رنگ کے فلمی گانے ہیں
کچھ چلتے پھرتے، چھوٹے چھوٹے، گشتی نعمت خانے ہیں
تر حلوہ گرم کڑاہی میں، دو لوٹے ہیں، اک ٹھیلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

لو اک جی دار بساطی نے ہر چیز لگا دی، چار آنے
کنگھی جاپانی چار آنے، شیشہ بغدادی، چار آنے
پتلی سی چھتری کے نیچے مومی شہزادی چار آنے
ہر گڑیا، پڑیا، باجا گاجا، ریشم، کھادی، چار آنے
بگلے کی چونچ میں مچھلی ہے، کیلے کے ساتھ کریلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

کیا کوچہ و دَر، کیا کوہ و کمر، گُلبرگ ہیں سب گلنار ہیں سب
خوشبو میں بسے گلزار ہیں سب رنگوں سے بھرے بازار ہیں سب
بچّے تو اکھڑ بچّے ہیں، بوڑھے بھی صبا رفتار ہیں سب
پوشاک میں "چوڑی دار" ہیں سب خوراک میں "مُرغامار" ہیں سب
ہر سُو خوشیوں کا ریلا ہے، من منگلا، دِل تربیلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

بچّے، بالے، گبھرو، بوڑھے، خوش وقت ہوئے، خوشحال ہوئے
جھولوں میں جھول کے پھول بنے، فٹ بال بنے بھونچال ہوئے
برقی چکّر میں چکرا کر چیخے تو خوشی سے لال ہوئے
اِک دُھوم دھڑکّے پھیرے میں سب پیسے استعمال ہوئے
سُندری کے کان میں مُندری ہے، شوہر کی جیب میں دھیلا ہے
یارو یہ عید کا میلہ ہے

زاہد کو مے پلا کے پشیماں ہیں ضمیر
نقد و گناہ دونوں ہمارے حساب میں

ریاکاری نہیں جاتی

تن آسانی نہیں جاتی، ریاکاری نہیں جاتی،
میاں برسوں میں یہ صدیوں کی بیماری نہیں جاتی
جنابِ شیخ یوں چلتے ہیں علم و فضل کو لے کر
کسی ٹھیلے سے جیسے کوئی الماری نہیں جاتی؛
یہ مکتب؛ جن کے کھُل جانے سے آنکھیں بند ہو جائیں
یہ دانش؛ جس کے آجانے سے بیکاری نہیں جاتی
میاں گلشیر خاں تم بھی ہوا کے رُخ کو پہچانو!
جہاں سائیکل چلی جاتی ہے پھُلکاری نہیں جاتی
سُنا ہے قیس پیدل دوڑتا ہے اَب بھی صحرا میں
سُنا ہے اُس علاقے میں کوئی لاری نہیں جاتی
ضمیرِ جعفری صاحب اٹھو کچھ کام فرماؤ
فقط رونے سے، میری جان! دشواری نہیں جاتی

ایشیا کے مطمئن بندوں کی یارب داد دے
اَبر کو اَبر، آسماں کو آسماں رہنے دیا

شمع تہہ خانے میں ہے ......

بہ تکلّف ہو ، تو پھر کیا لُطف یارانے میں ہے
آنکھ ہے عینک کے پیچھے ، ہاتھ دستانے میں ہے

فرق بس اتنا ہی عاقل اور دیوانے میں ہے
اُس کی مشعل بام پر ہے اِسکی تہہ خانے میں ہے

خط بھی دِلکش تھا پر اُن کی خُوش کلامی کیا کہیں !
جو مزہ ڈالی سے میوہ توڑ کر کھانے میں ہے

قیس ہی پر کچھ نہیں موقوف صحرا پیشگی ،
اِس طبیعت کا مُسافر اب بھی ویرانے میں ہے

سرد مہری کی وُہ خنکی ہے کہ یارو آج کل
شمع میں قلفی جمی ہے برف پروانے میں ہے

جلسۂ تعمیرِ مسجد کل پہ رکھیئے دوستو
آج مُجھ کو اِک ضروری کام میخانے میں ہے

وُہ تراشِ زُلف و اَبرو ہو کہ محرابِ قبا
ہے زنانے میں وُہی عالم جو مردانے میں ہے

ہم نے مانا زندگی حسبِ تمنّا تو نہیں
کونسی نیکی مگر گھبرا کے مرجانے میں ہے

ہر نفس اک تازہ تر اُلجھن کو سُلجھانا پڑا
آدمی گھر میں ہے یارب یا کسی تھانے میں ہے

دِل کے بے ترتیب و گرد آلود دفتر میں ضمیرؔ
یاد اُن کی اَب نہ جانے کونسے خانے میں ہے

مجھ سے مت گھر کا پتا پوچھو کہ جوشِ اشک سے
آجکل بندہ کوئی سات دریاؤں میں ہے

تاروں میں ہوتی ہے

نہ قالینوں میں ہوتی ہے، نہ دستاروں میں ہوتی ہے
بشر کی آبرو کچھ اور معیاروں میں ہوتی ہے

نہیں دیکھی تو دیکھو میرے شہکاروں میں ہوتی ہے
وہ خنکی جو قریب المرگ بیماروں میں ہوتی ہے

ہماری عاجزی کی خو پہ وہ بیگانہ خو بولا
یہ وہ خوبی ہے جو خستہ نمک پاروں میں ہوتی ہے

چمک تعلیم سے انسان میں آتی تو ہے اب بھی
مگر دل سے زیادہ آگ رخساروں میں ہوتی ہے

عجب کیا ہے جو بچے برق ہوں فہم و فراست میں
میاں بیوی کی بحث اب کھل کے اخباروں میں ہوتی ہے

کوئی رومی، کوئی رازی، کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی اُن کے میناروں میں ہوتی ہے

بشر کے دل میں احساسِ ندامت بھی بڑی شے ہے
عموماً اتنی نیکی سب گنہگاروں میں ہوتی ہے

چلو اچھا ہوا، ناداں ہیں وہ کم فہم ہوں میں بھی
غلط فہمی، ہمیشہ دو سمجھ داروں میں ہوتی ہے

جناب جعفری جو بول کہنا تول کر کہنا
کہ تیری شاعری کی بات درباروں میں ہوتی ہے

تار دیں

ہم تو اپنی زندگی بھی وار دیں
لوگ اگر کچھ تعزیت کے تار دیں

اس زمانے کا تقاضہ ہے کہ لوگ
دلبروں کو دل نہ دیں، دینار دیں

ہائے اُن کا سرسری سا اِلتفات
جس طرح خیرات ساہوکار دیں

ساز لے کر بزمِ موسیقی میں اب
باپ گائیں تھاپ برخوردار دیں

"ٹیڈیوں" کو کاش اہلِ مدرسہ
علم سے پہلے کوئی شلوار دیں

راہ و رسمِ دوستی ان سے ہوئی
جن سے در مانگیں تو وہ دیوار دیں

بات چھوٹی ہو تو ہو کچھ نہ ہو
مال وُہ جتنا بھی دیں تیّار دیں

کہیئے اب کرنل محمدؐ خان[۱] سے
شاعری کے ہاتھ میں تلوار دیں

۱؎ پاکستان کے ممتاز مزاح نگار ادیب اور "بجنگ آمد" کے مصنّف کرنل محمد خان

چاندنگر

کرنل بورمن کی قیادت میں خلائی جہاز "اپالو ہشتم" کی چاند کے مدار پر
کامیاب پرواز کے ساتھ پروازِ خیال ۔ ص

لو اُڑا "ہشتم اپالو" بند کونے کی طرح
تیرتا ہے آدمی انڈے میں چوزے کی طرح
چاند اب انساں کے قدموں سے بس اتنی دور ہے
جتنا چک لالے کے اسٹیشن سے کیمبلپور ہے
آسماں رُتبہ ہوئی ہے سرزمیں انسان کی
ہے عناصر پہ یہ اک فتحِ مبیں انسان کی
ہوتے ہوتے ملکِ آدم زاد ہو جائیگا چاند
رفتہ رفتہ صاحبِ اولاد ہو جائیگا چاند
آرزو کی روشنی، آسودگی کی جان چاند
حُسن، طلعت، رقص، راحت، رنگ، رس رومان چاند
چاند ہوگا اور زمیں کے گورے کالے مرد و زن
فتنہ و شر، سود و سودا، حیل و حجت، مکر و فن
بنک، سڑکیں، چوک، چوبارے، چمن، بازار، چاند
مدرسے، کالج، دفاتر، ممٹیاں، مینار، چاند

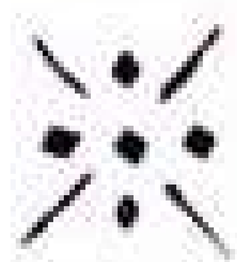
دشت و صحرا چاند، انساں چاند، چوپائے بھی چاند
گھر میں خود چاند، گلیاں چاند، ہمسائے بھی چاند

جتنے رقبے سے ہلالِ عید آتا ہے نظر
اس جگہ ہونگے، اگر ہوں گے مسلمانوں کے گھر

سنگ ہائے ناتراشیدہ کے مٹیالے مکاں
سادہ سادہ در کشادہ ڈیوڑھی والے مکاں

اِک اُترتی تیرگی، ویران دیواروں کے ساتھ
اِک لپٹتی روشنی مضبوط میناروں کے ساتھ

اِک کھلا میدان ہوگا بہرِ جلسہ و جلوس!
دائیں جانب سام تام اور بائیں جانب چین و روس



بورمن نے چاند کی تصویر جو بھجوائی ہے
سردسی تنہائی ہے، کچھ گرم سی گولائی ہے

ہم سمجھتے تھے سراسر روشنی والا ہے چاند
وہ یہ کہتا ہے کہیں گورا، کہیں کالا ہے چاند

کچھ گڑھے، کچھ غار، جن میں جا رہی ہیں سیڑھیاں
جانے کیوں ہیں، کونسے کام آ رہی ہیں سیڑھیاں

اس میں سُرغابی کہاں ہوگی کہ شادابی نہیں
کشورِ مہتاب میں کوئی بھی مہتابی نہیں

اِس کے دامن میں خود اپنی روشنی ہوتی نہیں
چاند تو ہوتا ہے لیکن چاندنی ہوتی نہیں
ہم سمجھتے تھے کہ یہ پورے کا پورا چاند ہے
وہ ادھورا اور اُدھارا، بجھا بجھا چاند ہے
نم نہیں، پتّا نہیں، ڈالی نہیں، سایا نہیں
چاند کا حلیہ ہمیں تو کچھ پسند آیا نہیں !

٭

ذہن میں لے کر نئی دُنیا کے امکانات کو
ایک میرے مہرباں کہنے لگے کل رات کو
کہہ رہی ہے ہم سے جو مُنّے کی ماں ہم بھی کریں
چاند پر جاکر کوئی کارِ جہاں ہم بھی کریں
ہو اگر اِک چائے کا اسٹال بر نوکِ ہلال؟
میری رائے میں تو "رش" لگے گا بہت نکلے گا مال
عِطر، پوڈر، تولیے، شیشے ہوں یا کریانہ ہو؟
تازہ پھل ترکاریاں رکھیں کہ مُرغی خانہ ہو؟
اِک اُڑن ہوٹل یہ اُڑائیں ساری پروازوں کے ساتھ
ہو سکے تو خود بھی اُڑ جائیں خلا بازوں کے ساتھ
ابتدا میں ایشیا کے لوگ ہونگے خال خال
کم ملے گی اطلاع [illegible] مشرق کے مسکینوں کا حال

وزنِ اشیا میں جو پیش آئے گی دشواری بہت
چاند بازاروں میں ہوگی چور بازاری بہت
چاندنی میں لطف آجائیگا اِس اندھیر کا
چیز اک پاؤ کی اور دام دو دو سیر کا
چاند کے مرکز میں قطعہ جات جب ہو تگے الاٹ
مجھ کو قسطوں پر دلا دیں ایک سُتھرا سا پلاٹ

(دسمبر ۱۹۶۸ء)

یُوں جہدِ للبقا سے نبٹتے رہے ضمیرؔ
لیٹے رہے کبھی تو کبھی دیکھتے رہے

کرکٹ نامہ

ہر چند کہ تھا مگر نہیں تھا

پاکستان، انگلستان کرکٹ ٹیسٹ میچ، کراچی میں، انگریز کھلاڑیوں کی
سست رفتاری سے عاجز آکر

بلّم بازوں کے شہر میں بلّے بازی کا جب شور ہوا
موسم کا مزاج انگریز ہوا، بھولا، سَر جوزف بھور ہوا
ڈیڈی گھر سے معذور ہوا، ٹیڈی کالج کا چور ہوا
گھس گھس پہ طبیعت گھبرائی، جھٹ پٹ سے کلیجہ "بور" ہوا
نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

موجود ہجوم خوش میں خوش اقبال بھی، خوش اقبالیاں بھی
نو غنچے، ڈھلمل شوہر، چھلبل بیویاں، کافر سالیاں بھی
لوگوں نے بجائیں تالیاں بھی، یاروں نے سنائیں گالیاں بھی
تنگ آ گئے دیکھنے والے بھی، زچ ہو گئیں دیکھنے والیاں بھی
نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

بولڈ BOWLED، کٹ CUT، ہٹ HIT، رن RUN، کیچ CATCH، میچ MATCH

بابو، مسٹر، مولانا، افسر، تاجر، ساہوکار آئے
بس، بگھی، موٹر، ٹم ٹم، رکشا، ٹھیلے میں اَسوار آئے
کچھ اپنے "چوکے" چھوڑ آئے، کچھ اپنے "چھکے" مار آئے
اک آدھے میچ میں بیٹھے بیٹھے پوری عمر گزار آئے

نے کَٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رَن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

سیروں چلغوزے ڈھیر ہوئے، چلتی رہی پیالی چائے کی
یاں نعمت مرغِ مسلّم کی، واں دعوت اونچے پائے کی
اِک ریس[1] مچی کھانے پینے میں ہمسائے سے ہمسائے کی
انگریزی سے جب اکتائے، اردو میں ہائے ہائے کی

نے کٹ باجی، نے ہٹ لاگی، نے رن بھاگی، نے کیچ ہوا
یہ کھیل بھی کوئی کھیل ہوا، یہ میچ بھی کوئی میچ ہوا

---

[1] ریس RACE

تماشائی

(ایک کرکٹ میچ میں)

گلرخوں کے خال کی باتیں کریں
کم سِنوں کے سال کی باتیں کریں
"بیٹ" کی عظمت کا افسانہ سنائیں
"بال" کے اقبال کی باتیں کریں

دور بینوں کو گھما کر دور تک
ہر پری تمثال کی باتیں کریں
اپنی اپنی چاندنی کا ذکر ہو
اپنے اپنے "مال" کی باتیں کریں

اُس کو چوکس فیلڈ پر شاباش دیں
اِس کے برعکس "کال" کی باتیں کریں
دلبروں کے قد و گیسو ناپ کر
شال کی اور "فال" کی باتیں کریں

رُخ پہ دیں پنجاب کو داد نظر
زُلف سے بنگال کی باتیں کریں
مہ وشوں کے جگمگاتے شہر میں
دل کے استعمال کی باتیں کریں

چلئے اب صدّیقؔ کے چل کر ضمیرؔ
غالبؔ و اقبالؔ کی باتیں کریں

ہال کے بال

(ویسٹ انڈیز کے تیز رفتار باؤلروں کے ہال کا کھیل دیکھ کر)

شور اُٹھّا کہ ہال آتا ہے
کھیل کا انتقال آتا ہے
ہالؔ پر جب جلال آتا ہے
"بال" سے پہلے حال آتا ہے
ہم کو کو تو کچھ نظر نہیں آتا
لوگ کہتے ہیں "بال" آتا ہے
الاماں اِس کی برق رفتاری
"بال" ہے یا خیال آتا ہے
"بال" آتا ہے یا نہیں آتا
کچھ مگر لال لال آتا ہے

ے پروفیسر صدّیق کلیم، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

ایرانی بہو کا خیر مقدم

ہمارے چھوٹے بیٹے عزیزی امتنان ضمیر حیدر نے ۱۹۷۹ء میں، جب وہ لندن میں مقیم تھا، ایک ایرانی لڑکی ماری صوفی سایہ وکش کو اپنی رفیقۂ حیات بنالیا۔ ماری ایران کے ایک خوبصورت کوہستانی قصبہ املش کے شہر دار ارباب عبدالعلی کی دختر نیک اختر ہے۔ ہماری بڑی بہو عزیزہ وبینہ (بیگم میجر احتشام ضمیر حیدر) بھی ہمارے گھر کا اُجالا تھی۔ بحمد اللہ کہ اب اس اجالے میں ایک نئی روشنی اور نئے رنگ کا اضافہ ہوگیا۔ ض

ماری و امتنان کی شادی
باعثِ انبساط و آبادی،

تازگی امتزاجِ دلکش کی
یہ ہے جہلم کا وہ ہے املش کی

دو اُجالوں کی باہم آمیزی
ایک پنجابی ۔ ایک تبریزی

لڑ گئی تھی نگاہ لندن میں
ہوگیا پھر بیاہ لندن میں

چاندنی —— بام سے اُتر آئی
فارسی — "نارسی" کے گھر آئی



سادہ پانی بھی آبِ ناب ہوا
بسترِ عام ــ "رختِ خواب" ہوا

کالی چڑیا ــ پرندِ گل دُم ہے
کھاٹ اب تخت ہے، گھڑا "خُم" ہے

کیسہ "تھیلہ" ہے "ظرف" برتن ہے
گفتگو کرنا ــ "حرف کردن" ہے

یاں جو ابتر ہے واں بھی ابتر ہے
نوکر ــ ایران میں بھی "نوکر" ہے

نام ہر شے کا شاعرانہ ہے
"میرزا خضمی" ایک کھانا ہے

ہمہ خانہ تمام ایرانی
اک نمکدانی ہے نمک دانی

گھر میں چھوٹی سی آرسی، ڈبی ہے
ساری برکت یہ فارسی کی ہے

نام جب فارسی کمند ہوا
دال کا مرتبہ بلند ہوا

جب کوئی شے دکاں سے آتی ہے
اک مثال اصفہان سے آتی ہے

سوئے مطبخ "نپیش" بہ جاں آید
کہ وہاں ــ "بوئے مولیاں" آید

جہاں کرتے تھے ماشما حمّام
اب نہاتے ہیں حافظؔ و خیّام

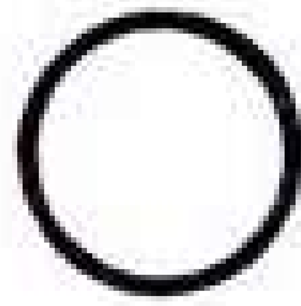


شاخِ شیشم پہ بُلبلِ شیراز
میرے فرزند تیری عمر دراز

گھر میں ہے امن و آشتی دن رات
کہ نہیں ساس اور بہو میں بات

ساس بیچاری ساس خُو ہی نہیں
دُو بہ دُو کیا ہو ــ گفتگو ہی نہیں

جب بہو نے پیاز پیاز کیا
ساس نے بوسہ نیاز لیا



گھر میں پھرتی ہے دختروں کی طرح
بالکل اپنے کبوتروں کی طرح

فاصلہ قربتوں میں شیر و شکر
روح مانوس - اجنبی پیکر

درسِ تاریخ ہم ورق ہے بہت
نقشِ تہذیب مشترک ہے بہت

ذائقہ ہے وہی پلاؤ کا
خواہ ہو اُس میں گوشت گاؤ کا

نسبتِ طیبہ و حجاز وہی
روضہ خوانی وہی، نماز وہی

طرزِ ذہن و نمِ نمو بھی وہی
فکرِ عقبیٰ و ذکرِ ھو بھی وہی

زندگی کے اساس۔ اصول وہی
رہ وہی۔ رب وہی، رسولؐ وہی

اقبال اور ہم

اقبال کا پیام اخوت کا ترجماں
ملّت کو دیکھیے کہ ہے آپس میں ہم نبرد
داعی وہ فقر کا تھا پیمبر خودی کا تھا
تن پر ہمارے قرض کی پوشاکِ لاجورد

"کہتا تھا شالامار میں کل ایک برگِ زرد
بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد"

تجاہل

گلی نگر پہ دھیان نہ تھا
روزنِ در پر آنکھ نہ تھی
شہر کے شور پہ کان نہ تھا
ہم سمجھے خاموشی ہے
جیسے بجلی جنگل میں
شاخ و شجر کو راکھ کرے
ہم نے کب شعلہ دیکھا
ہم نے کب آواز سُنی؟

صاحب اور میں

(انگریزی سے ماخوذ ایک ــــ تابلیو)

سَو باتوں کی ایک ہی بات   تگڑا اُوپر والا   ہاتھ

مجھ سے کام میں ہو تاخیر

کاہل سُست خطاب ملے   فردِ حساب خراب ملے

صاحب سے گر ہو تاخیر

برجستہ اُس کی تعبیر

(ق)

کرتا ہے ماتحت ضمیر

"یارو کیس پُرانا تھا

اس میں دفن زمانہ تھا

درد۔ بخار اور کھانسی میں

صاحب جاکر جھانسی میں

چھانٹ رہے ہیں تفصیلات   سَو باتوں کی ایک ہی بات

تگڑا اُوپر والا   ہاتھ"

(۲)

کوئی کام!

ہم سے ہو کم سرانجام　　صاحب بولے — "ہڈحرام"

خود چاہا جب کرنا کام　　"سر" سے ہو کب سرانجام

برسوں تک!

گنا کاٹ کے سرسوں تک
"مِسل" رہی اٹکی لٹکی
فرض کی پھانس کہاں کھٹکی

لوگ مگر چپ رہتے ہیں
بولیں بھی تو کہتے ہیں
صاحب کا کچھ دوش نہیں
اس کو اپنا ہوش نہیں

کام رہے موقوف بہت
صاحب تھا مصروف بہت

(۳)

میں صاحب کی تعریف کروں
اتنا ہی کہوں

وہ دانش و حکمت والا ہے
قد چھوٹا ہے۔ سَر بالا ہے
جو ہم چشموں کا ٹولا ہے
ہر فرد اُس کا بڑبولا ہے
یہ ٹولہ کب چُپ رہتا ہے
کہتا ہے
تو صاحب کے دل دماغ پہ "مکھن" پالش کرتا ہے
کیا بڑھیا مالش کرتا ہے

(۴)

لیکن صاحب! —— میرا صاحب
جب اپنے "باس" سے کہتا ہے
تُو فخرِ وطن تُو نازِ زمن!
تُو دھوپ میں برگد کی چھاؤں
تُو موتی ہے تُو کُندن ہے
تُو کھیت پہ برسا ساون ہے
تو اِس کا نام تعاون ہے

(۵)

دُنیا کے کِسی "بابو گھر" میں
مرے صاحب سا
کوئی صاحب کم بنیاد نہیں
مری ہر خامی ازبر اُس کو،
مری کوئی خوبی یاد نہیں

(۱۹۸۲ء)

چوری کا مال

اک مردِ مجرّد کے گھر سے
چوروں کے ہاتھ جو مال آیا
اس مال کو دیکھ کے بیاہے ہوؤں کو حال آیا
رنگین بلاؤز جاپانی
مُسکے مُسکے ــــ دَرقے دَرقے
کچھ شب جامے دَر کے دَر کے
کچھ نیم شلو کے نسوانی
لبنانی
جن سے جھلکے گوری کا بدن
آویزے ــ فرغل ــ بال کلپ
اُودے اُودے! دھانی دھانی!
اس مردِ مجرّد کے گھر سے
ہر شے نکلی ــــ "نامردانی"

(ماخوذ)

ایک ظریف کی قبر کا کتبہ

یہ ہے لزلے جیک کی قبر
کندہ جس پر آیۂ صبر
جسماً نازک نرم نحیف
قِسماً۔ نازک، نرم، نحیف
ڈربی کے بازاروں میں جوتے پالش کرتا تھا
لوگ ہوئے ریٹائر جب
بھر گیا ڈربی شائر جب
مہنگے ہو گئے ٹائر جب
لزلے گنجے پنشنروں کے سر کی مالش کرتا تھا
اب بھی گویا ایک طرح کے جوتے پالش کرتا تھا

(انگریزی سے ماخوذ)

مسز ولیم

مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
کبھی مکھن۔ کبھی پتھر کبھی افیون تھی یارو!

فرانسیسی بلی انگریزیوں میں بات کرتی تھی
وہ دِن گلیوں میں رہتی تھی، کلب میں رات کرتی تھی
تکلّم میں پُرانی بلبلوں کو مات کرتی تھی
گئی گزری سہی، لیکن گزر اوقات کرتی تھی

تلوّن کیشِ اتنی — جنوری میں جُون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

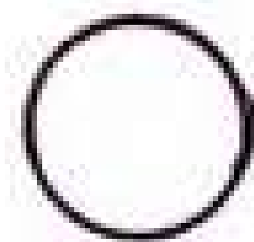
وہ آنکھیں بحرِ اطلانتک کے نیلے پانیوں جیسی
بدن یونانیوں جیسا، نظر مصرانیوں جیسی
جوانی میں بگھنگم کی جواں ملکانیوں جیسی
طبیعت نا ملائم — مستقل اُستانیوں جیسی

وہ خود منصف تھی، خود مُجرم تھی، خود قانون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

فرنگ و ایشیا میں بانکپن مشہور تھا اُس کا
دلوں میں آگ سُلگانے کا فن مشہور تھا اس کا
دہن معدوم تھا لیکن سُخن مشہور تھا اُس کا
وہ عورت تھی مگر مردانہ پن مشہور تھا اُس کا

محلے بھر کی افواہوں کا ٹیلی فون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

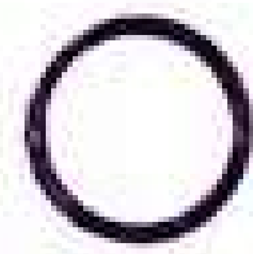
بڑی ہی زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ۔ تازہ روغنی رُخسار رکھتی تھی
گھڑی۔ پرس اور چھتری ہر گھڑی تیار رکھتی تھی
گھر انگلستان میں۔ عاشق سمندر پار رکھتی تھی



وہ کھانا بے حساب اُس کا، وہ پینا بے ہراس اُس کا
بھرا رہتا تھا ہر مشروب رنگیں سے گلاس اُس کا
بڑے اونچے طرب خانوں میں ہوتا تھا مساس اُس کا
بدلتا تھا۔ بہر تقریب غازہ اور لباس اُس کا

کبھی گھگھرا۔ کبھی پتلون ہی پتلون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

زبان زد عام تھیں لندن میں خوش اندامیاں اُسکی
انوکھی تھیں ہر اک مادام سے "بادامیاں" اُسکی
کئی تھانوں کے اندر مشتہر تھیں خامیاں اُسکی
کہ شہزادوں سے بھی منسوب تھیں بدنامیاں اُسکی



ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں، لوچ بانہوں میں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی نگاہوں میں
وہ اس سن میں بھی اک سروِ رواں تھی سیرگاہوں میں

کبھی لندن۔ کبھی دہلی کبھی رنگون تھی یارو !
مسز ڈیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

شب آدینہ جب سر جان ینگ آتے تھے گھر اس کے
کئی کوٹھوں سے اُڑ اُڑ کر پتنگ آتے تھے گھر اس کے
ملنگ آتے تھے اور پی پی کے بھنگ آتے تھے گھر اسکے
گریجوایٹ۔ "ایل ایل بی لفنگ" آتے تھے گھر اس کے
سول سروس کے مُرغان وکلنگ آتے تھے گھر اس کے
جری جرنیل آمادہ بہ جنگ آتے تھے گھر اس کے
امیرالبحر نیوی کے نہنگ آتے تھے گھر اس کے

زر و زیور جواہر رنگ رنگ آتے تھے گھر اس کے
شلنگ آتے تھے اور بھرتے شلنگ آتے تھے گھر اسکے

وہ شب گردوں کے حق میں مستقل شب خون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

(انگریزی ماخوذ سے)

سفارتی زبان

بہم آشتی کا نیا فارمولا
جو ہم نے قبولا
یہ مانا کہ یہ نسخۂ ماسبق کے
برابر نہیں ہے
مگر اس کو دیکھیں اگر ہم
بحیرہ خزر کے تناظر میں رکھ کر
عرب سے اُٹھا کر
پشاور میں رکھ کر
نتائج کو چکھ کر
تو معلوم ہوگا
کہ اس فارمولے سے کمتر نہیں ہے
بظاہر یہ جس کے برابر نہیں ہے

دہلی - (جن پتھ ہوٹل) ۱۲، مارچ ۱۹۸۴ء

بادشاہ کی محبوبہ

مجھ سے محبت ہو جس کو
اُس کے اندر مٹی کی
آخر کچھ خوشبو تو ہو



بے شک آپ کا نام بلند
تخت نگاریں۔ بام بلند
منظر گُل اندام بہُت
جس میں نہ ہو کوئی خامی
وہ انسان ہے خام بہت

(شیکسپیئر سے ماخوذ)

اُلّو اور بُلبُل

دانا ہی سہی

اُلّو سے نہ رائے مانگ کبھی

سُن بانی ــ شاخ پہ جھومتی گاتی بُلبل کی

یا ــ سبزہ و گُل میں گھلی ہوئی

اور کِھلی ہوئی

ست رنگ پروں کی "لالی"[1] سے

اس بے فکری دیوانی سی

مستانی کلفی والی سے



تجھے آس ملے

تری پیاس بجھے

تسکین ۔ سُرور ۔ مٹھاس ملے



جیسے شاعر کے بول کہ مَن میں جا اُتریں

اور "بور" کتھا پر چارک کی

---

[1] ۔ لالی LARK

(انگریزی شاعر آسٹن سے ماخوذ)

ضمیریات

مایوس مضمحل ہیں یتیم دلسیر ہیں
وہ بھی مری طرح ہی ترقّی پذیر ہیں

جن کا کلام خام وہی بر سرِ کلام
نادسترس جو ہاتھ وہی دستگیر ہیں

ان کے سُخن سے کھل نہ سکا آج تک کہ وہ
"ریح الحریر"[1] ہیں کہ "مسیح المصیر"[2] ہیں

جن کے اُداس رُخ پہ ہے سب سے زیاد گرد
یہ آسمانِ علم کے بدرِ مُنیر ہیں

ہم اپنے حق میں آپ ستم آفریں رہے
زندہ ہیں آج تک کہ بہت خوش خمیر ہیں

اب عام آدمی کو ترستی ہیں بستیاں
سب ساکنانِ شہر ۔ شیوخِ کبیر ہیں

مٹی کے اس قدیم دیئے کا کرم بھی دیکھ
بجلی جہاں نہیں، وہیں روشن ضمیر ہیں
الزام بے وفائی کا ہم پر غلط غلط
جانِ ضمیر ہم تو مزاجاً وزیر ہیں

(۱۹۸۳ء)

لے ۲ے بے معنی الفاظ

کسی سے ملاقات ہونے لگی ہے
تھا ڈر جس سے وہ بات ہونے لگی ہے

الٰہی یہ کیا بات ہونے لگی ہے
سحر ہے مگر رات ہونے لگی ہے

ہلاکت کا سامانِ نَو وضع ہو گا
کہ "تخفیفِ آلات" ہونے لگی ہے

"لبوبِ روایات" سے شاعری اب
"سفوفِ خیالات" ہونے لگی ہے

بڑھاؤ نہ اب اور نفری پولیس کی
کہ دُنیا حوالات ہونے لگی ہے

سیاست، محبت — کوئی منطقہ ہو
طویل آجکل رات ہونے لگی ہے

وسائل کا تو آپ کو علم ہو گا
مسائل کی بہتات ہونے لگی ہے

ذکاہاتِ منظوم سے پھر ہماری
فعولن فِعولات ہونے لگی ہے

ضمیرؔ اپنے جذبات قابو میں رکھنا
کہ تجھ سے تری بات ہونے لگی ہے

(۱۹۸۳ء)

سایا ہے ساعتوں پہ یہ کن واقعات کا
سورج کی روشنی میں اندھیرا ہے رات کا

بوسہ تو "ماڈرن لبِ خوباں" کا خوب تھا
کھانا بھی کھا سکو گے کبھی اسکے ہاتھ کا؟

سادہ سی داستاں ہے حرم کے زوال کی
بے دخلیوں کا ذکر یا "مدخولیات" کا

اپنی سیاست، اپنا نظامِ معاشیات
پگڑی کسی کی، طرّہ سکندر حیات کا

کیا پوچھتے ہو گردشِ ایام کی روش
دیکھا نہیں ہے آپ نے قلعہ رُداتت کا

برّصغیرِ ہند میں انسان آج تک
بھرتا ہے ساگ پات کا یا ذات پات کا

اپنے چمن کا حال یہ ہے جیسے گاؤں میں
کیکر کٹا پڑا ہو کسی شاملات کا

امریکہ اور روس نے اے ربّ کائنات
ٹھیکہ لیا ہوا ہے تری کائنات کا

تا حشر ماں کے پیار کو ترسے گی زندگی

ڈھلنے کو ہے خراد سے انسان دھات کا

واعظ بھی کچھ گھٹا تو نہیں علم دین میں
مینار ہے عرب کے سِلے پارچات کا

دیکھو ضمیرؔ کو کہ غزل کی صراحی سے
کھولے ہوئے ہے درّۂ خیبر حیات کا

(۱۹۸۲ء)

راتیں مہتاب سے خالی ہیں　　یا ساری بھیڑیں کالی ہیں
تو اپنا دُنبہ سمجھ ہمیں　　تیری آنکھیں دُنبالی ہیں
جو باہر جتنے پھیل گئے　　اندر سے اُتنے خالی ہیں
اقبال کے چیلوں کو دیکھو　　اکثر "مجرم اقبالی" ہیں
اک روٹی اصل حقیقت ہے　　باقی اصنام خیالی ہیں
امریکہ ہو یا روس میاں　　دونوں رفلیں دو نالی ہیں
اُمیدیں ہیں یا لوگوں کی　　اولادیں لے کر پالی ہیں

ورثے میں ملیں جتنی چیزیں
کچھ پی لی ہیں ، کچھ کھا لی ہیں

۱۹۸۲ء

آدمی جتنا مہذب ہو گیا
اُتنا ہی بیگانۂ رَب ہو گیا

دیکھ کر اس کو بڑی حیرت ہوئی
جانے وہ اتنا بڑا کب ہو گیا

شیخ کی ہر "گلّ" ادھوری رہ گئی
جو برہمن نے کہا سب ہو گیا

اُس کی اُمیدوں کی سیرابی نہ پوچھ
جو تمہارے "ہاتھ کا ٹب" ہو گیا

ہر سڑک پر اب سنو میری "بڑک"
شہر داروغہ "رجاسب[1]" ہو گیا

---

[1] محبّی راجہ رجاسب خاں ۔ کپتان پولیس (۱۹۸۲ء)

زندگی کو راس تو آیا نہ راس مَیں
جس قدر رکھو اس تو ہے اُسقدر رکھو اس مَیں

دے گئی اسلامیوں کو یہ سبق جنگِ یہود
مصر سے ملائیشیا تک گھاس تو ہے گھاس مَیں

زندگی کا ضابطہ باہر نکلتا ہی نہیں
مدتوں سے منجمّد ہوں فی الصدور الناس مَیں

کتنی کتنی، کسطرح، کِس کِس کو دوں جمہوریت
گھر گیا۔ "نا میٹرک پاسوں" میں "بی اے پاس" مَیں

ڈیوڑھی ہی میں سہی۔ کرسی نشینی تو ملی
مفلسوں کی صف میں ہوں اک فردِ خاص الخاص مَیں

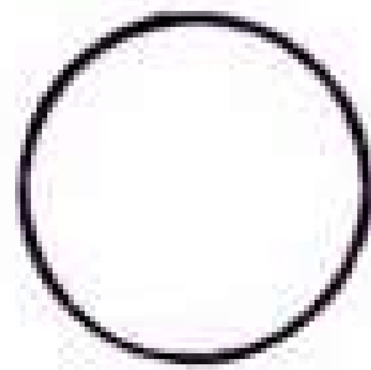
بے در و دیوار سی ہے میری طبعِ دفتری
محکمہ مَیں۔ میز میں ہوں "باس"۔ مَیں قرطاس مَیں

شاعری ہے زندگی کے "کوکا کولا کا پلانٹ"
شعر میری بوتلیں ہیں قلزمِ احساس مَیں

رس ہے جس تن رس نچوڑے، تیل جس کُن تیل دے
گلشنِ اُمیّد کا تربوز تو، خشخاس مَیں

وہ محبت کی ہو بازی یا سیاست کا ہو کھیل
ہار جاؤں کھیل لیکن جیت جاؤں "ٹاس" میں
عشق لفظوں سے وَرا اک فعل ہے ورنہ ضمیرؔ
وہ تھا پیرس کا پرندہ اور خیبر پاس میں

(۱۹۸۲ء)



کیجئے اسلاف کی قبریں فروخت
اِس طرح مٹّی کو گھی کر لیجئے
اتنے بچّے ہوں کہ گھر میں مُستقِل
"گھاگرا پلٹن" کھڑی کر لیجئے

خوب تھے سالکؔ[1] ترے مہمان بھی
کھا گئے روٹی بھی دسترخوان بھی

---

[1] برادرم کیپٹن صدیق سالکؔ

آدمی تو شہر میں بے حال دیکھا جائے گا
بھینس کا گوبر "بلند اقبال" دیکھا جائے گا

حشر کے دن نامۂ اعمال دیکھا جائے گا
ہم یہ سمجھے تھے وہاں "فٹ بال" دیکھا جائے گا

عشق میں وہ بھی گریباں چاک — آوارہ پھرے
کس سے مستورات کا یہ حال دیکھا جائے گا

سج رہی تھی جس جگہ کل تک کتابوں کی دکان
اس جگہ اب "لکڑیوں کا ٹال" دیکھا جائے گا

آج کے جھنجھٹ سے فرصت ہی نہ پائی آج تک
اگلے دن کا کام اگلے سال، دیکھا جائے گا

منحصر اس بات پر ہے فیصلہ اقتدار کا
"مانگ" دیکھی جائے گی یا مال دیکھا جائے گا

روس و امریکہ کی نیت غیر مبہم ہے مگر
مچھلیوں سے مانجھیوں کا جال دیکھا جائے گا!

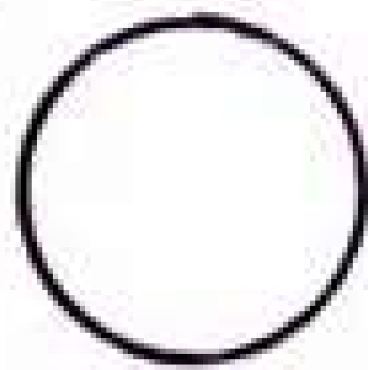
روح میں پھیلی ہوئی اس سرد پیلی ریت میں
تجھ سے کیونکر اپنا چہرہ لال، دیکھا جائے گا

کھیت سے اُگتی تھی جو، اب وہ کھُلی فرصت کہاں
اب تو گھر گھر وقت کا گھڑیال دیکھا جائے گا
مجلسیں تو دیکھ لی ہیں مجلسِ اقوام تک
اب ذرا "چوپال" کو بھی "پال" دیکھا جائے گا
میری اُردو میں مری مٹی کی خوشبو کے طفیل
دیکھنا — بھوپال ہیں چکوال دیکھا جائے گا
وقت سے کہہ دو کہ آخر تک ضمیرؔ جعفری
جب بھی دیکھا جائے گا چونچال دیکھا جائے گا

خوں ہے مگر جنوں نہیں، نیند ہے خواب کے بغیر
جینا ہے محض حاضری۔ عہدِ شباب کے بغیر
آج کا یہ اُداس زرد بے لباس آدمی
سیخ کباب کے بغیر، جام شراب کے بغیر
کون ہے جو کہیں کہیں تھوڑا بہت غلط نہیں
زندگی اک سوال ہے ٹھیک جواب کے بغیر
کیوں نہ ہو کم نَم و نُمو ــ افریقا اور ایشیا
علم، کتاب کے بغیر ــ خرچ، حساب کے بغیر
روئے زمیں پہ وہ درخت شاید ابھی اُگا نہیں
چڑیاں جہاں چہک سکیں، خوفِ عقاب کے بغیر
اپنی نگاہ اور پسند؟ ــ ہم کو تو ناپسند ہیں
آب، شراب کے سوا، پھول گُلاب کے بغیر
اپنی زمیں ہے اپنی ذات باقی ہیں سب تکلفات
لاف گزاف میری بات، راوی چناب کے بغیر

کیسے کروں میں اتباع امریکہ اور روس کا
یہ انقلاب کے بغیر، وہ احتساب کے بغیر
کیسے گزار دی ضمیر تو نے یہ "نیم سینچری"
شب، ماہ تاب کے بغیر، دن آفتاب کے بغیر

(۱۹۸۲ء)



نظر اُٹھی بھی ہماری اگر کسُو کی طرف
گئی تھی رُو کی طرف جا پڑی گلُو کی طرف
یہ رام نام کی مالا جپن سے کیا حاصل؟
کہ دھیان مے کی طرف ہے نظر سبُو کی طرف
ہم اک الگ سا جزیرہ ہیں شانت ساگر میں
نہ ماسکو کی طرف ہیں نہ ٹوکیو کی طرف
خدا نہ بدلے گا آئین ایشیا کے لئے

نمُو نمُو سے ہے پیدا۔ لہُو، لہُو کی طرف

ولائتیں ہیں "سپر کشوروں" کے زیرِ نگیں
یہ اِس "ولی" کی طرف ہے، وہ اس "گُرو" کی طرف

ہوائے سیر و سفر تو ہمیں زیادہ نہیں
یہ "آبِ جُو" لیے پھرتا ہے آب جُو کی طرف

ہمارے پاس تو وہ لوٹ کر نہیں آئی
صبا گئی تو تھی بُستانِ آرزو کی طرف

کہاں چلے ہو کلامِ مبیں سنانے کو
مشاعرہ تو ہے "مرغانِ خوش گلو" کی طرف

(۱۹۸۳ء)

منزلوں کی جگہ راستہ لکھ دیا
لکھنے والے مرے حق میں کیا لکھ دیا

درد کو نسخۂ کیمیا لکھ دیا
نام کس چیز کا ارتقا لکھ دیا

میں تو اسکے اک اک لفظ سے جل اُٹھا
خط لکھا یا خطِ اُستوا لکھ دیا

کب کچہری لگی، کب گواہی ہوئی
منصفوں نے مگر فیصلہ لکھ دیا

شیخ صاحب بجا مجھ سے ناراض ہیں
مَیں نے "اُستر" کو بھی "اُسترا" لکھ دیا

سب نگر ایک سے ہیں مگر بام پر
ٹیکسلا لکھ دیا، کوئٹہ لکھ دیا

اے عزیزانِ فردا تمہیں کیا خبر
ہم سے جیسے بھی لکھا گیا لکھ دیا

(۱۹۸۳ء)

ہم یہ سمجھے تھے کچھ "مک مکا" ہو گیا
"ارتقا" تو مگر "ایشیا" ہو گیا

کیا کروں اے خداوند! میں کیا کروں
سازِ ہستی اگر بے سُرا ہو گیا

آج ہم بے نشاں بے گماں ہی سہی
یہ نہ سمجھو کوئی فیصلہ ہو گیا

ہونٹ چُپ تھے مگر داستاں بن گئی
پاؤں شل تھے مگر فاصلہ ہو گیا

یہ سمجھ لو کوئی گھر سلامت نہیں
سرحدوں میں اگر راستہ ہو گیا

ایسی کج صف نمازوں سے کیا فائدہ
جن سے خود آدمی ہی قضا ہو گیا

چھپ جوانی کی یا حکمرانی کی تھی
اک برس ہی میں وہ کیا سے کیا ہو گیا

خود انا اپنے حق میں بلا ہو گئی
آدمی آدمی کا خدا ہو گیا

(۱۹۸۳ء)

جس طرح کوئی حسین جوگن جواں جوگی کے ساتھ
بعض قومیں ماس کھاتی ہیں مگر گوبھی کے ساتھ
شیخ جی کی بات چل سکتی نہیں اس دور میں
وہ یہ کہتے ہیں کہ موٹر باندھ لو بگھی کے ساتھ
فاصلہ اوصاف میں الفاظ سے پیدا ہوا
ہم "ادیب عالم" کے پیچھے، آپ "ایل ایل بی" کے ساتھ
سادگی کی بات مرمر کی سِلوں پر بیٹھ کر
جَو کی روٹی جس طرح کھاتا ہو کوئی گھی کے ساتھ
لُطف کی تجدید گویا قتل کی تمہید تھی
امن کا نسخہ لکھا جاتا رہا برچھی کے ساتھ
پھول دھرتی پر، ستارے آسمانوں میں نہیں
وہ "چندر بنسی" بنے پھرتے ہیں تاریکی کے ساتھ
مشرق و مغرب ہو، وہ اقوام یا افراد ہوں
کون راتیں جاگتا ہے مستقل رو گی کے ساتھ
پیر[1] صاحب آپ کو کچھ زیب تو دیتی نہیں
مَن کی باتیں تن پہ اِک دو تین مَن چربی کے ساتھ

---

[1] میرے بعض احباب مجھے ازراہِ محبت "پیر و مرشد" بھی کہتے ہیں۔ ص ض

ایک چمچہ شہد کا اور ایک ٹکڑا نان کا
امتحاں روزانہ لیتا ہے مرے ایمان کا

کر لیا اک جست میں گو ماہ و انجم کو شکار
مر نہیں پایا ابھی تک بھیڑیا انسان کا

ربط و ضبط فرد و ملّت اسلئے بھی خبط ہے
بڑھ گیا مضمون سے رقبہ مرے عنوان کا

کارخانوں کی اُدھاری چمنیوں سے کیا ملا
دُھند کچھ برطانیہ کی، کچھ دُھواں جاپان کا

ساحلوں پر کون سنتا تھا پرندوں کی پکار
کشتیاں ڈوبیں تو اندازہ ہوا طوفان کا

بحر و بر چھائے مگر نعم البدل دیکھا نہیں
اپنی ریشم جان کا، اپنے سمندر خان کا

دیدنی ہے بعض تو آزاد ملکوں کا چلن
پیٹ میں روٹی نہیں ہے منہ میں پتّہ پان کا

زندگی کی ہر پرت میں بس یہی دیکھا ضمیر
گرد موٹر کار کی ۔ چالان گاڑی بان کا

۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء

لہ بائرن ایونیو ۔ ہنولو ۔ لندن ۔ آشیانہ غلام علی بُلبل کشمیری

اُن سے اِک دن ملاقات ہو جائے گی
جس سے ڈرتے ہیں وہ بات ہو جائے گی

اپنے سورج پہ اتنا بھروسہ نہ کر
دن کے ہوتے ہوئے رات ہو جائے گی

اشک پینے سے پرہیز ہے اس لئے
دل کے اندر "نباتات" ہو جائے گی

آدمی ذات بھی دھات بن جائے گا
زندگی محض آلات ہو جائے گی

ہے یہی حسِ حرکت تو پھر زندگی
حسرتوں کی حوالات، ہو جائے گی

ذہن میں ہو اگر کوئی روشن کرن
وہ ستاروں کی بارات ہو جائے گی

کب تک آفاق و انفاس کی فرصتیں
ایک دن آخری رات ہو جائے گی

"شاہ ڈیرے"[1] تک ابر آج آیا تو ہے
لگ رہا ہے کہ برسات ہو جائے گی

(۲۸ فروری ۱۹۸۳ء)

[1] یہ اشعار حمزہ والی (ضلع مظفر گڑھ) اپنے کھیت چھپر میں کہے گئے۔ ض

آدمی

تھا کبھی عِلم آدمی ، دِل آدمی ، پیار آدمی
آج کل زر آدمی ، قیصر آدمی ، کار آدمی

کلبلاتی بستیاں ، مشکل سے دو چار آدمی
کِتنا کمیاب آدمی ہے ، کتنا بسیار آدمی

پتلی گردن ، پتلے ابرو ، پتلے لب پتلی کمر
جِتنا بیمار آدمی ، اُتنا طرحدار آدمی

زندگی نیچے کہیں منہ دیکھتی ہی رہ گئی
کِتنا اُونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

عُمر بھر صحرا نوردی کی مگر شادی نہ کی
قیسِ دیوانہ بھی تھا کِتنا سمجھدار آدمی

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزار آدمی

دِل رہینِ صومعہ ، دستار رہنِ میکدہ
تھا ضمیرِ جعفری بھی اِک مزیدار آدمی

پہلے کشتی ڈوب جاتی تھی نظر کے سامنے
اب گرے گا بحرِ اوقیانوس کے پار آدمی

تو مرا و مَن ترُا ......

حدیثِ دوست

(از :- نذیر احمد شیخ)

خاندانی سیّدوں کی آل ہیں میجر ضمیر
نیک ہیں، خوش بخت ہیں خوشحال ہیں میجر ضمیر
شاعر و افسر بلند اقبال ہیں میجر ضمیر
اس لیے کچھ "فیٹ"[1] ہیں کچھ "ٹال"[2] ہیں میجر ضمیر

آپ اپنے وقت کے مُلاّ نصیر الدّین ہیں!
شعر شکر آفریں ہیں چٹکلے نمکین ہیں،
اِن کی رنگ آرائیوں سے محفلیں رنگین ہیں
قہقہوں کا دائمی بھونچال ہیں میجر ضمیر

شعر خوانی میں ترنّم کا عجب انداز ہے
لَے میں کافی نغمگی ہے گونجتی آواز ہے
خود توانا ہیں پہ سازِ درگلو ناساز ہے
سُر ملاتے ہیں مگر بے تال ہیں میجر ضمیر

آپ کی ہر پارٹی میں ہر ڈنر میں مانگ ہے
خواہ دو سو میل ہے وہ خواہ دو فرلانگ ہے

---

[1] فیٹ FAT   [2] ٹال TALL

ایک میں شامل کھڑے ہیں دُوسری میں ٹانگ ہے
موٹروں میں جابجا ارسال ہیں میجر ضمیر

آپ کے طرزِ سخن پر ہر سخن کا خاتمہ
آپ پڑھ لیں تو سمجھ لو انجمن کا خاتمہ،

اِن سے جو مخصوص ہے اس طرزِ فن کا خاتمہ
دِل پسند اشعار کی ٹکسال ہیں میجر ضمیر

دفتروں میں صاحبانِ علم شاگردی کریں
کچھ چڑھا کر "کیمرے میں قلم" شاگردی کریں

کچھ پکڑ کر سگرٹوں کی چلم شاگردی کریں
کتنے حلقوں کے گرد گھنٹال ہیں میجر ضمیر

مرد وزن ہیں انجمن در انجمن گھیرے ہُوئے
کالجوں میں طالبانِ علم و فن گھیرے ہُوئے

مدرسوں میں نونہالانِ وطن گھیرے ہُوئے
مُفت بٹتے لڈّوؤں کا تھال ہیں میجر ضمیر

رُخصتانے شادیاں "منظوم" تے ہیں آپ بھی
جس جگہ ہو دُھوم برپا "دُھومتے" ہیں آپ بھی

گھومتی ہے جب زمیں تو گھومتے ہیں آپ بھی
کوئی برسی ہو، وہاں ہر سال ہیں میجر ضمیر

ہر کسی سے پُرخلوص و بامروّت دوستی،
ہر ادیبِ نامور سے بے ضرورت دوستی

ہر مدیر، دہ پبلشر سے خوبصورت دوستی
دوستی میں مردِ استقلال ہیں میجر ضمیر

افسری بھی، شاعری بھی، خلق کی خدمات بھی
مشرقی عادات بھی ہیں مغربی حالات بھی
جانے کتنی اُلجھنیں ہیں فی الصدر الذات بھی
اپنے حق میں سخت مشکل پال ہیں میجر ضمیر

حاضری ناکام گھر میں پرسشِ یاراں بہت
کار ہیں صبح و مسا بیگارِ بے کاراں بہت
گھر سے باہر کھینچتی ہے خدمتِ دوراں بہت
فون کھڑکے تو سمجھیے "کال[1]" ہیں میجر ضمیر

اور اپنی شاعری کا کوئی مطلب ہو نہ ہو
من ترا حاجی بگویم تو مرا مُلّا بگو
شاعرانِ شوخ گو اب رہ گئے ہیں صرف دو
ایک میں ہوں دوسرے چونچال ہیں میجر ضمیر

واہ چھاؤنی ۱۱؍ جولائی ۱۹۶۸ء

---

[1] کال CALL

واہ رے شیخ نذیر!

پاکستان کے منفرد مزاح نگار شاعر، نذیر احمد شیخ کا منظوم تعارف، جو اُن کے
مجموعۂ کلام "حرفِ بشاش" میں بھی شامل ہے۔ (ص)

شاعر، سائنسدان، قلندر، رند، امیر، فقیر
شعر طبیعت، سائنس روٹی، رندی شغل کبیر

پیر ستارہ گیر!
واہ رے شیخ نذیر!

ترک و طلب کی حد سے آگے ہر الھڑ ارمان
ہنستا ساحل، بہتا دریا، نغموں کا طوفان،

ہر نغمہ گھمبیر!
واہ رے شیخ نذیر!

پھرتا ہے بازاروں میں خوش وقت سُبک رفتار
اُجلے کپڑے، پیاسی آنکھیں، کالی موٹر کار

جینے کی تدبیر!
واہ رے شیخ نذیر!

شاعرِ خوش افکار مگر شہرت کی ہوس سے دُور
اپنی شیرینی میں گُم اِک لڈّو "موتی چُور"
خوشبو گوشہ گیر!
واہ رے شیخ نذیر!

فکر و فراست کی گرمی میں کرنوں کا سیلاب
ذہن و زباں کی نرمی میں پھولوں کا درخشاں خواب
تیزی میں شمشیر!
واہ رے شیخ نذیر!

مغرب میں جانے کس رنگ سے گزرے ماہ و سال
مشرق میں جب حضرت آئے غائب سر کے بال
حیرت کی تصویر!
واہ رے شیخ نذیر!

کالر، ٹائی، دھوبی، نائی سے وحشت دوچند
کرتے اور تہہ بند میں خوش، خود نیچے، خودی بلند
پورے بھگت کبیر!
واہ رے شیخ نذیر!

دفتر میں اک اعلیٰ افسر، قابل اور متین!
یاروں میں وہ نٹ کھٹ سب کی دُم میں باندھے ٹین
گھر میں سیدھا تیر!
واہ رے شیخ نذیر!

مشرب آزادانہ، دِل میٹھا، چہرہ نمکین
رند مگر آئینہ باطن، شیخ مگر بے دین

فیل ہے بے زنجیر!
واہ رے شیخ نذیر!

شام کو موٹر گشت پہ جب یہ نکلیں بے پرواہ
ساتھ کئی احباب" بِلا پٹرول بِلا تنخواہ"

فِطرت[1]، گذن[2]، ضمیر!
واہ رے شیخ نذیر!

ستمبر ۱۹۵۷ء

---

[1] شاعرِ پوٹھوار حضرت عبدالعزیز فطرت مرحوم
[2] ڈاکٹر غضنفر علی گذن مرحوم (راولپنڈی)

